اپنے چھوٹے سے گھر کی کھڑکی میں سے جھانکتے شمس علی کی نظریں سج سج قدم اٹھا کر گھر کی طرف بڑھتی حسینہ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ گندمی رنگت پر تیکھے نقوش اور سیاہ گھٹاؤں جیسے بالوں کی مالک حسینہ صرف نام کی ہی نہیں بلکہ سچ مچ کی حسینہ تھی جس کا سانچے میں ڈھلا بدن شادی کے دس سال بعد بھی روزِ اول جیسا شاداب و پُرکشش تھا۔ دو بچوں کی پیدائش نے بھی اس بدن کی خوبصورتی کو ذرا نہ گہنایا تھا بلکہ وہ دس سال پہلے کے مقابلے میں قدرے گداز ہو کر پہلے سے بھی زیادہ پُرکشش ہو گئی تھی۔ وہ چھتیس سال کی تھی لیکن اسے دیکھنے والے مشکل سے ہی تیس کا اندازہ لگا پاتے تھے۔ دس سال پہلے شمس علی جب اسے انڈیا کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے بیاہ کر لایا تھا تو اسے لگا تھا اس کی لاٹری نکل آئی ہے۔

حسینہ کے حسن نے اسے مدہوش سا کر دیا تھا حالانکہ حسینہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت نہیں تھی۔ حسینہ سے شادی سے پہلے شمس علی کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی پہلی بیوی رضیہ آٹھ سالہ رفاقت کے بعد دوسرے بچے کی پیدائش کے وقت اسے داغِ مفارقت دے گئی تھی۔

رضیہ سے شمس علی کی پہلی بیٹی تھی جس کا نام ناجیہ تھا۔ ماں کی وفات کے وقت ناجیہ کی عمر تقریباً ساڑھے چھ برس تھی۔ دادی اور ماں کی زبانی جلد ہی کسی ننھے منے بھائی یا بہن کی آمد کی نوید سن کر جوش سے بھری، منتظر سی ناجیہ کے لیے ماں کی موت بہت بڑا صدمہ ثابت ہوئی تھی۔ جس ننھے مہمان کے ساتھ وہ کھیلنے کودنے کے خواب دیکھتی تھی وہ ننھا مہمان ماں کو اپنے ساتھ کھیلنے کے لیے دوسری دنیا میں لے گیا تھا۔ ناجیہ چند پل کے لیے دنیا میں آ کر اپنی ماں کو ساتھ لے جانے والے اس ننھے مہمان سے سخت شاکی رہتی تھی۔ اس کے دن کا زیادہ تر حصہ رو رو کر ماں کو پکارنے اور دادی سے بے جا ضدیں کرنے میں گزرتا تھا۔ دادی کے لیے اس عمر میں گھر کے کام کاج کے ساتھ ناجیہ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ دوسری طرف شمس علی کی اجاڑ صورت دیکھ کر بھی ان کا دل دکھتا تھا۔ انہوں نے اچانک ہی فیصلہ کیا کہ کچھ عرصے کے لیے انڈیا چلا جائے۔ انڈیا کے مختلف شہروں میں ان کے عزیز و اقارب بستے تھے اور دادی کا خیال تھا کہ کچھ عرصہ ان کے درمیان رہ کر شمس علی اور ناجیہ پر چھائی ماتمی کیفیت ختم ہو جائے گی۔ یہ تو شمس علی کو مختلف عزیز و اقارب کے گھروں میں مختصر قیام کے بعد ایک چھوٹے سے گاؤں میں مقیم اپنے ماموں کے گھر پہنچ کر اندازہ ہوا کہ ماں کے اس دورۂ انڈیا کے پیچھے اصل وجہ کیا ہے؟ ماموں کی چھ عدد بیٹیاں تھیں۔ جن میں سے بہ مشکل دو کو وہ اپنے گھر کا کر پائے تھے۔ وہ دو بھی زیادہ سکھ میں نہیں تھیں اور باپ کے گھر کی طرح سسرال میں بھی عسرت زدہ زندگی گزار رہی تھیں۔ حسینہ بہنوں میں سب سے بڑی تھی، باوجود حسین ہونے کے چھبیس سال کی عمر میں بھی بن بیاہی ماں باپ کے در پر بیٹھی تھی۔ بقول ماموں کے جب کم عمری میں اس کے رشتے آتے تھے تو ان کے پاس اتنی گنجائش بھی نہیں تھی کہ جہیز کے نام پر بیٹی کو دو جوڑے اور چند برتن ہی دے سکیں۔ چنانچہ حسینہ کی عمر نکل گئی اور آنے والے رشتوں کا رخ اس کی چھوٹی بہنوں کی طرف مڑ گیا۔

اپنے گاؤں کے رواج کے مطابق اوور ایج ہو جانے والی حسینہ کے لیے جب شمس علی کی ماں نے بھائی کے سامنے دامن پھیلایا تو انہوں نے ہاں کرنے میں لمحہ بھی نہ لگایا۔ رشتوں کی کمیابی، غربت اور بیٹی کی تیزی سے بڑھتی عمر نے انہیں شمس علی اور حسینہ کی عمروں کے درمیان موجود فرق سے، شمس علی کے رنڈوے ہونے اور بیٹی کے اتنی دور چلے جانے تک کچھ بھی نہیں سوچنے دیا تھا یوں شمس علی حسین و جمیل حسینہ کو بیاہ کر اپنے ساتھ پاکستان لے آیا۔ حسینہ کے ساتھ نے پہلے اسے رضیہ کی موت کا غم بھلایا اور پھر اس کے بطن سے جنم لینے والے دو بیٹوں میں گم کر وہ دنیا میں چند سانسیں لے کر واپس پلٹ جانے والے اپنے بیٹے کا ملال بھی بھول گیا۔ شمس علی کی ماں بھی اس شادی کے چار برس بعد معمولی بخار، کھانسی کے چند دن کاٹ کر خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ ماں کی موت کو شمس علی نے ایک معمول کے حادثے کی طرح قبول کر لیا۔ ناجیہ کچھ دن اداس رہی، پھر بہل گئی۔ یوں بھی وہ ان چار سالوں میں حسینہ کے بہت قریب آ گئی تھی۔

حسینہ کو جانے کیا جادو آتا تھا کہ ہر ایک کو اپنا بنا لیتی تھی۔ شمس علی اس کی رفاقت میں بے حد خوش اور مطمئن تھا۔ گھر کا انتظام بھی بخیر و خوبی چل رہا تھا کہ شادی کے نویں سال وہ منحوس واقعہ پیش آ گیا۔ مل میں کام کے دوران شمس علی کا دایاں ہاتھ مشین میں آ کر ضائع ہو گیا۔ مل مالکان نے علاج معالجے کے علاوہ معمولی رقم دے کر شمس علی کو نوکری سے فارغ کر دیا۔ مل سے ملنے والی معمولی رقم گھر کا چولہا کب تک روشن رکھتی۔ آخر نوبت فاقوں کے قریب آ پہنچی ایسے میں حسینہ نے کمر ہمت کسی اور گھر سے باہر نکل کر نوکری کرنے کا فیصلہ کیا۔ شمس علی کے لیے حسینہ کا نوکری کرنا بہت تکلیف دہ تھا لیکن مجبوری ایسی تھی کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ شمس علی نے اپنی ہی مل میں ایک جاننے والے ٹھیکیدار سے بات کر کے حسینہ کو دوسری عورتوں کے ساتھ دھاگا بھرنے،

کاٹنے اور اسی طرح کے چھوٹے موٹے کاموں پر لگوا دیا۔ حسینہ روزانہ صبح آٹھ بجے سے شام چار بجے تک مل میں کام کرنے لگی اور یوں اس کی معمولی آمدنی نے گھر والوں کو فاقہ کشی سے بچا لیا۔ شمس علی نے بھی ہمت پکڑی اور گھر پر بچوں کے ساتھ کاغذ کے لفافے بنانے کا کام کرنے لگا۔ شمس علی کا تو ویسے بس نام ہی تھا ورنہ اصل محنت بچے ہی کرتے تھے۔ شمس علی تو اکثر اپنے مجروح ہاتھ میں وقت بے وقت اٹھنے والے درد کے باعث کام کرنے سے معذور ہی رہتا تھا۔ پھر اس کے ایک ہاتھ سے کیے گئے کام کی وقعت ہی کیا تھی۔ جتنی دیر میں بچے تین درجن لفافے بنا لیتے اتنی دیر میں شمس علی مشکل سے ایک درجن لفافے ہی بنا پاتا تھا۔ بہر حال پھر بھی کسی نہ کسی طرح زندگی ایک مخصوص ڈگر پر چل پڑی تھی۔ شمس علی بھی بہت جلنے کڑھنے کے بعد کسی حد تک قسمت پر شاکر ہو کر پُرسکون ہو گیا تھا کہ ایک چھوٹے سے واقعے نے اس پُرسکون جھیل کے پانی میں گرنے والے پتھر کے مانند ارتعاش پیدا کر دیا۔ حسینہ کام کے دوران ایک دن گرمی کی شدت سے مل میں بے ہوش ہو گئی۔ ٹھیکیدار نے اسے اپنے بائیس تئیس سالہ بیٹے کے ساتھ جسے وہ ان دنوں کام سکھانے کی غرض سے اپنے ساتھ مل لانے لگا تھا، گاڑی میں گھر بھجوا دیا۔ ٹھیکیدار کی یہ ہمدردی شمس علی کو بہت مہنگی پڑی۔ اب ہونے یہ لگا تھا کہ ہفتے عشرے میں ایک دن حسینہ ضرور ہی ٹھیکیدار کے بیٹے کے ساتھ اس کی گاڑی میں گھر آتی۔ کبھی کبھی لڑکا گھر کے اندر بھی آتا اور چائے کی پیالی چڑھانے کے دوران خوش گپیاں کرتا رہتا۔ حسینہ اس کے الٹے سیدھے چٹکلوں پر بہت دل کھول کر ہنستی تھی۔ ناجیہ کے ہونٹوں پر بھی شمس علی کو دبی دبی سی مسکراہٹ دکھائی دے جاتی تھی۔ دونوں بیٹے بھی اس لڑکے کی آمد سے بہت خوش ہوتے تھے۔ ایک اکیلا شمس علی ہی تھا جو اس صورتحال پر کڑھتا رہتا تھا کیونکہ وہ اکیلا ہی یہ بات سمجھ سکتا تھا کہ حسینہ اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ حسینہ کی اس بدلتی روش کے بعد ہی شمس علی نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ وہ اس کے مل سے واپس آنے کے وقت گھر کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوتا تا کہ جان سکے کہ وہ اکیلی آئی ہے یا ٹھیکیدار کے لڑکے کے ساتھ۔ لڑکا بہر حال ہر بار گھر کے اندر نہیں آتا تھا۔

آج بھی شمس علی اپنی معمول کی نگرانی کے لیے ہی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ حسینہ آج پھر لڑکے کے ساتھ اس کی گاڑی میں آئی تھی۔ لڑکا حسینہ کے ساتھ گاڑی سے نہیں اترا تھا لیکن اس کی نظریں حسینہ کے عقب میں تھیں۔ شمس علی جانتا تھا کہ ہمیشہ ساڑھی پہننے والی حسینہ، جس کی ساڑھی کا پلو اس کی پتلی کمر پر کھسکا رہتا تھا، جب اپنی مخصوص لچکیلی چال چلتی ہوئی قدم اٹھاتی ہے تو اس کی سیاہ بل کھائی ہوئی ناگن سی چوٹی کتنے ردھم سے کسی گھڑی کے پنڈولم کی طرح اس کی پشت پر متحرک رہتی ہے۔ ٹھیکیدار کے بیٹے کی نظریں بھی شاید اسی دلفریب نظارے میں الجھ کر پلٹنا بھول گئی تھیں اور اس نے حسینہ کے اتر جانے کے باوجود گاڑی آگے نہیں بڑھائی تھی۔ شمس علی اپنی جگہ کھڑا کھڑا مارے طیش کے بل کھاتا رہا۔ اس کے بس میں ہوتا تو اس بدتمیز لڑکے کی آنکھیں پھوڑ ڈالتا۔ مگر بس ہی تو نہیں چلتا تھا۔ اندر ہی اندر جوش مارتے غصے کی شدت کے دوران اس نے بیرونی دروازے پر دی جانے والی دستک اور ناجیہ کے دروازے کی طرف بڑھتے قدموں کی آوازیں سنیں۔ لکڑی کا سالخوردہ دروازہ تیز چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز کے ساتھ ہی شمس علی نے لڑکے کو رخ موڑ کر گاڑی اسٹارٹ کرتے دیکھا اور پھر لمحے بھر میں وہ اپنی گاڑی کے ساتھ ہوا ہو گیا۔ شمس علی اس کے اس انداز پر فقط اپنے اکلوتے سلامت ہاتھ کی مٹھی بھینچ کر رہ گیا۔

☆☆☆

وہ انٹرویو کے لیے آنے والی تیسری لڑکی تھی۔ اسے دیکھ کر معظم چونک سا گیا تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی یہ لڑکی پہلے انٹرویو دے کر جانے والی دونوں لڑکیوں کے مقابلے میں بہت سادہ اور معصوم دکھائی دیتی تھی۔ اس کا دھلا دھلایا میک اپ سے بیزار چہرہ گواہ تھا کہ اسے کسی دفتر میں ملازمت کا تو کجا، انٹرویو دینے کا بھی تجربہ نہیں ہے۔ اس بات کا اندازہ اس کی حرکات و سکنات میں موجود گھبراہٹ سے بھی لگایا جا سکتا تھا۔ مگر معظم ان وجوہ کی بنا پر نہیں چونکا تھا۔ اس کے چونکنے کی وجہ وہ احساس مانوسیت تھا جو لڑکی کو پہلی نظر دیکھتے ہی اس کے دل میں ابھرا تھا۔ لڑکی کے چہرے پر نظریں جمائے وہ اس احساس کی وجہ کھوج رہا تھا۔ اس کھوج میں اسے اس بات کا بھی احساس نہیں تھا کہ لڑکی اس کے یوں مسلسل خود کو گھورنے پر پزل ہو رہی ہے یا یہ کہ اس کے ساتھ انٹرویو کی اس کارروائی میں شریک منیجر اس کے خلاف معمول انداز پر حیران و پریشان ہے۔ اس بات کا احساس اسے اس وقت ہوا جب منیجر نے لڑکی کے ڈاکومنٹس پر مشتمل فائل اس کے سامنے رکھی۔ وہ چونکا، سیدھا ہوا اور پھر انٹرویو کا آغاز کیا۔

"آپ کا نام؟"

"کنول منیر" لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا۔ معظم کو

لڑکی کی شخصیت کی مناسبت سے یہ نام بہت بھلا معلوم ہوا۔ وہ واقعی کنول کے پھول کی طرح ہی تروتازہ اور پاکیزہ معلوم ہوتی تھی۔

"تعلیم؟" معظم نے اپنے سامنے کھلی فائل میں موجود دکھائی دیتے اس کے بائیوڈیٹا کو نظرانداز کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ابھی کچھ دن پہلے بی۔ اے فائنل کے پیپرز دیے ہیں۔" لڑکی نے قدرے جھجک سے بتایا۔ اس کی اس جھجک کی وجہ شاید یہ تھی کہ اخبار میں انٹرویو کے لیے دیے جانے والے اشتہار میں واضح طور پر گریجویشن کی ڈیمانڈ کی گئی تھی۔ معظم نے اسے یہ بات جتائے بغیر انٹرویو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے اگلا سوال پوچھا۔

"ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ میں مہارت حاصل ہے آپ کو؟"

"تھرڈ ائیر سے [illegible] شارٹ ہینڈ فی الحال نہیں آتی مگر میں سیکھ لوں گی۔" کنول حسیر نامی اس لڑکی کا سر یہ جواب دیتے ہوئے اچھا خاصا جھک گیا تھا۔ معظم کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ خود بھی اس جاب کے لیے مطلوبہ اہلیت نہ رکھنے سے اچھی طرح واقف ہے لیکن شاید کوئی مجبوری تھی جو محض قسمت آزمائی کے خیال سے وہ یہاں چلی آئی تھی۔

"اوکے، مس کنول! آپ تشریف لے جائیں۔ انٹرویو کے رزلٹ سے آپ کو آگاہ کر دیا جائے گا۔" معظم نے یکدم ہی انٹرویو کا سلسلہ ختم کرتے ہوئے اس سے کہا تو اس کے چہرے پر ڈھیروں مایوسی چھا گئی۔ یقیناً اسے انٹرویو کے محض تین سوالوں میں ختم ہو جانے پر اپنے رد کر دیے جانے کا احساس ہوا تھا۔ مایوس کن انداز میں کرسی سے کھڑے ہونے کے بعد وہ میز کی سطح پر انگلیاں ٹکا کر جس انداز میں پل بھر کو رکی اسے دیکھ کر معظم کو لگا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن پھر معظم کے اندازے کے برخلاف وہ بنا کچھ کہے ہی تیزی سے پلٹ کر باہر نکل گئی۔

"افتخار صاحب! اس لڑکی کے نام کا اپائنٹمنٹ لیٹر ہوا کر آج ہی اس کے گھر بھجوا دیں اور پلیز باقی امیدواران کو بھی آپ خود نمٹا لیں، میں مزید اس سلسلے میں یہاں نہیں رک سکوں گا۔" کنول حسیر کے باہر نکلنے کے بعد معظم کی زبان سے جو جملے ادا ہوئے وہ منیجر افتخار کے لیے کسی بم کے دھماکے سے کم نہیں تھے۔

"جی سر...؟" اس نے بے حد عجیب نظروں سے معظم کو دیکھتے ہوئے یوں اس سے پوچھا جیسے اس کی بات کو سمجھ نہ سکا ہو۔

"میں نے آپ سے کہا ہے افتخار صاحب کہ میں نے اپنی سیکرٹری کی پوسٹ کے لیے مس کنول حسیر کو منتخب کر لیا ہے۔ آپ ان کے نام سے اپائنٹمنٹ لیٹر جاری کروا دیجیے۔" معظم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اپنی بات دہرائی۔ ویسے وہ منیجر کے رویے کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ بے چارا سخت حیران تھا کہ ایک ایسی لڑکی جو کسی طور بھی اس پوسٹ کے لیے مطلوبہ اہلیت نہیں رکھتی تھی کس بنیاد پر منتخب کر لی گئی ہے جبکہ اس سے پہلے انٹرویو دے کر جانے والی دونوں لڑکیاں اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہل تھیں۔

"اوکے سر! ایز یو وش۔" منیجر نے "مجھے کیا؟" کے انداز میں معظم کو جواب دیا۔ معظم اس کے اس انداز کو نظرانداز کرتا ہوا اپنا بریف کیس اٹھا کر دفتر سے باہر نکل گیا۔ فی الحال منیجر کی حیرانی کو دور کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ خود حیران تھا کہ ایک محض ذرا سے احساسِ شناسائی کے تحت اس نے کنول حسیر کو اپنی سیکرٹری کے طور پر منتخب کر لیا؟

☆☆☆

"اماں! مجھے نہیں کھانی یہ لوکی کی بھجیا۔ میرے لیے کوئی انڈا [illegible] دو۔" رات کے کھانے کے لیے سب دسترخوان پر بیٹھے تو چھوٹا اظہر لوکی کی بھجیاں دیکھ کر منہ بسورنے لگا۔

"اچھا [illegible] میں تمہارے لیے انڈا [illegible]" [illegible] اٹھنے لگی۔

"[illegible] میں [illegible] ہوں۔" ثانیہ نے اسے روکا۔

"نہیں، اماں کو [illegible] تم کو پتا ہے [illegible] نہیں آتا۔" اظہر نے منہ ایک بار پھر [illegible] حمیدہ اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کتنی بری بات ہے اظہر! اماں پورے دن کی تھکی ہوئی کام پر سے واپس آئی ہیں اور تم نے انہیں ایک اور کام پر لگا دیا۔" ثانیہ نے اظہر کو گھورتے ہوئے اس کی حرکت پر سرزنش کی۔

"تو چھوڑ بھی دے ثانیہ! تیری ماں کون سا [illegible] کے دھکے کھاتی ہوئی گھر واپس آئی ہے جو تھک گئی ہو گی۔ [illegible] افسروں کی طرح گاڑی میں بیٹھ کر آئی ہے۔ [illegible] معظم [illegible] بھی افسروں کی طرح ہی بیٹھ کر [illegible] [illegible] جواب [illegible]

رہا تھا طنز سے بولا۔

''وہ تو چھوٹے شاہ صاحب کی مہربانی ہے ابا، جو کبھی کبھار اماں کو اپنی گاڑی میں چھوڑ جاتے ہیں پر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اماں کوئی افسر لگ گئی ہے۔ ذرا دیکھا کرو جب گھر واپس آتی ہے تو سر کے بالوں اور ساڑھی پر کتنا رواں چپکا ہوتا ہے۔'' ناجیہ نے فوراً حسینہ کی حمایت کی۔

''جادوگرنی! ہر ایک کو اپنا دیوانہ بنا لیتی ہے۔'' شمس علی لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے زیرِلب بڑبڑایا۔ پھر منہ میں موجود لقمے کو دو تین دانت مار کر چبانے کی رسم پوری کرنے کے بعد نگلتے ہوئے بہ آوازِ بلند ناجیہ کو جھڑکنے کے انداز میں بولا۔

''جا جا۔ زیادہ چمچہ گیری مت کر ماں کی۔ مجھے سب پتا ہے کہ یہ جو تیری ماں کبھی کبھی چوڑی بندے لا کر دے دیتی ہے تجھے، یہ ساری محبت اسی کا لالچ ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ابا! تم غلط سمجھ.....'' ناجیہ جلبلا کر صفائی دینے لگی تھی کہ چنگیر میں میٹھا پراٹھا لے کر آتی حسینہ نے اشارے سے اسے چپ ہو جانے کو کہا۔ شمس علی کی طنزیہ باتیں اس چھوٹے سے گھر کے باورچی خانے میں اس تک پوری طرح پہنچی تھیں لیکن وہ سمجھتی تھی کہ مزاج کا یہ تیکھا پن شمس علی کی معذوری، تکلیف اور بیکاری کے باعث ہے اس لیے اس کی ایسی باتوں کو ہر بار نظر انداز کر جاتی تھی۔ اس بار بھی وہ شمس علی کی کڑوی بات کو درگزر کر گئی۔ ناجیہ بھی اس کا اشارہ پا کر خاموش ہو کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ انور تو پہلے ہی اس گفتگو سے بے نیاز کھانے میں منہمک تھا، اظہر بھی اپنا من پسند میٹھا پراٹھا پا کر اس کے مزے میں گم ہو گیا۔ کھانا بے حد خاموشی سے کھایا گیا۔ شمس علی نے اپنی معمول کی خوراک سے بہت کم روٹی کھا کر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

''ناجیہ! دودھ ہے تو ذرا گرم کر کے ایک کپ میں اپنے ابا کے لیے نکال دے۔''

ناجیہ کے ساتھ دسترخوان سمٹوا کر حسینہ نے باورچی خانے میں چیزیں ٹھکانے پر رکھتے ہوئے اسے ہدایت دی۔

''دودھ ہے تو اماں! مگر صرف ایک ہی کپ۔ صبح چائے کے لیے پریشانی ہو جائے گی۔''

ناجیہ نے جھجکتے ہوئے حسینہ کو صورتِ حال بتائی۔ تو وہ خود بھی قدرے تذبذب میں پڑ گئی۔ تنخواہ ملنے میں ابھی پانچ کا ایک دن باقی تھا اور حسینہ کے پاس محض اتنے ہی روپے بچے تھے کہ کل کے دن ڈیوٹی پر جانے آنے کے لیے بس کا کرایہ دے سکتی۔

''صبح اور دودھ منگوا دوں گی۔ تو یہ دودھ اپنے ابا کے لیے نکال دے۔'' پل بھر کی سوچ کے بعد حسینہ نے سر جھٹکتے ہوئے ناجیہ کو حکم دیا۔ وہ ایک دن بس کے بجائے پیدل بھی چل جا سکتی تھی۔ بس اس کے لیے اسے معمول سے آدھے گھنٹے پہلے گھر سے نکل کر اس شارٹ کٹ کو استعمال کرنا پڑتا جسے وہ اس کی ویرانی کے باعث استعمال کرنے سے گریز ہی کیا کرتی تھی۔ ناجیہ نے اس کے حکم کی تعمیل میں چپ چاپ دودھ گرم کر کے کپ میں نکال دیا۔ حسینہ کپ لے کر اس کمرے میں چلی گئی جس میں اس کا اور شمس علی کا بسیرا تھا۔ دوسرے کمرے میں ناجیہ اور دونوں بچے سوتے تھے۔ شمس علی چارپائی پر اپنا بایاں ہاتھ سر کے نیچے رکھے چت لیٹا تھا۔ اس کی نظریں اپنے دائیں ہاتھ پر جمی تھیں جسے کہنی سے ذرا نیچے سے کاٹ دیا گیا تھا۔

''یہ دودھ پی لو۔'' حسینہ، شمس علی کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کے قریب جا کر ملائمیت سے بولی۔

''دودھ..... کس نے کہا تھا تجھ سے یہ دودھ لانے کو؟'' شمس علی چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ لہجے سے چڑچڑا پن اب بھی جھلک رہا تھا۔

''کسی نے نہیں کہا تھا لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم نے کھانا صحیح سے نہیں کھایا اسی لیے میں تمہارے لیے یہ دودھ لے آئی۔'' حسینہ اپنے لہجے کی نرمی کو قائم رکھتے ہوئے آہستہ سے چارپائی پر پائنتی کی جانب ٹک گئی۔ شمس علی بھی اب لیٹے سے

اشتہارات

ضرورت ہے ایک ایسے مولوی صاحب کی جو ہمارے خاندان بھر کی خوشیوں، مسرتوں اور کامیابیوں کے لیے دعا کر سکیں۔ بالخصوص بیرونِ ملک کے ویزے اور لوڈ شیڈنگ کے لیے دعا کرنے کا جنہیں وسیع تجربہ ہو اور جن کی دعا میں تاثیر ہو، ذیل کے پتے پر رجوع کریں۔ وظیفہ حسبِ قبول دعا دیا جائے گا۔

☆☆☆

اگر آپ دل پھینک واقع ہوئے ہیں تو آج ہی ہمارے شوروم میں تشریف لا کر اپنی پسند کے بہترین ''دل'' خرید لیے اور روزانہ کسی نہ کسی کو ایک دل دیجیے۔ ایک سے زیادہ سیٹ کے خریداروں کے لیے خصوصی رعایت۔ یاد رکھیے! ہمارے ہاں بہترین پلاسٹک کے ''دل'' بنائے جاتے ہیں۔

اٹھ بیٹھا تھا۔

''مجھے نہیں پینا یہ دودھ۔'' شمس علی نے کسی بچے کی طرح منہ پھلا کر انکار کیا۔

''کیسے نہیں پینا؟ میں تو پلا کر ہی رہوں گی۔'' حسینہ نے ناز سے کہتے ہوئے کپ شمس علی کے ہونٹوں سے لگایا۔ اس بار شمس علی مزاحمت نہیں کر سکا اور چپ چاپ حسینہ کے ہاتھوں سے دودھ پی لیا۔ وہ یونہی تو اسے جادو گرنی نہیں کہتا تھا، اسے معلوم تھا کہ حسینہ کا قرب کیسے لمحوں میں بندے کو پگھلا دیتا ہے۔ وہ پچھلے دس سال سے بہ خوشی اس کے سامنے پگھلتا رہا تھا لیکن اب کچھ عرصے سے دل میں ایک پھانس اٹک گئی تھی۔ اس پھانس کی دکھن اپنے کٹے ہوئے ہاتھ اور دن بہ دن لاغر ہوتے جسم کو دیکھ کر کچھ اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ اب پھر وہ بے خیالی میں اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا۔ اس کے ٹنڈ منڈ حصے پر اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیاں پھیر رہا تھا۔

''کیا درد ہو رہا ہے ہاتھ میں؟'' حسینہ نے فکر مندی سے پوچھتے ہوئے خود اپنی انگلیاں اس جگہ رکھیں جہاں شمس علی کی انگلیاں متحرک تھیں۔ اس کی انگلیوں کے اعجاز مسیحائی کو محسوس کرتے ہوئے شمس علی نے نفی میں گردن ہلائی اور پھر شکوہ کرنے کے انداز میں بولا۔ ''تجھے کیا پروا میرے درد کی؟ تجھے تو دوسرے دھندوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔''

''تیری فکر کیسے نہیں ہوگی مجھے، پر دوسرے دھندے بھی تو زندگی کی ضرورت ہیں۔'' حسینہ نے بایسیت بھری مسکراہٹ سے شمس علی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا تو وہ چپ سا ہو گیا۔ خاموشی کا یہ وقفہ دو منٹ پر مشتمل تھا جسے شمس علی کی آواز نے توڑا۔

''میری ایک بات مانے گی حسینہ؟'' وہ متذبذب سا حسینہ سے پوچھ رہا تھا۔

''وہ کیا؟'' حسینہ پر دن بھر کی تھکن سوار ہونے لگی تھی لیکن وہ شمس علی کی دلجوئی کے لیے خود پر جبر کیے بیٹھی تھی۔

''تو ساڑھی چھوڑ کر شلوار قمیص پہننا شروع کر دے۔'' شمس علی کہنا تو بہت کچھ چاہتا تھا لیکن فقط اتنا ہی کہہ سکا۔

''ساڑھی چھوڑ دوں؟ گیارہ سال کی عمر سے یہی پہن رہی ہوں کبھی اس کے سوا کچھ اور پہنا ہی نہیں۔ اب تو کچھ اور پہننے کا خیال ہی عجیب لگتا ہے۔ پر تم بتاؤ، تمہیں اچانک یہ کیا سوجھی؟'' حسینہ حیران حیران نظروں سے شمس علی کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''اچانک نہیں سوجھی۔ بہت عرصے سے سوچ رہا تھا کہ تجھ سے یہ بات کروں۔ اب دیکھ ناں پہلے کی بات اور تھی۔ تو دن بھر گھر میں رہتی تھی پر اب تو تجھے باہر نکل کر مردوں کے درمیان کام کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں یہ پہناوا کچھ مناسب نہیں لگتا۔'' شمس علی کچھ خجل سا اپنی بات کی وضاحت دینے لگا۔

''ٹھیک ہے۔ میں ناجیہ سے کہوں گی کہ میری ساڑھیوں کو کاٹ کر میرے لیے شلوار قمیص سی دے۔ وہ آج کل سامنے والی چاچی سے سلائی کٹائی کا کام سیکھ رہی ہے۔ اچھا ہے اسے بھی ہاتھ کی صفائی کا موقع مل جائے گا۔'' حسینہ نے زیادہ بحث کیے بغیر شمس علی کی بات مان لی کہ نیند سے بوجھل ہوتی پلکیں اب اس بات کی اجازت بھی نہیں دے رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد وہ ہر طرف سے بے نیاز چارپائی پر لیٹی گہری نیند سو رہی تھی۔ شمس علی اپنی چارپائی پر بیٹھا اس کے حشر ساماں وجود کو دیکھ رہا تھا۔ یہ وجود پچھلے دس سال سے اس کی نیندیں اڑاتا آ رہا تھا لیکن آج نیند اڑنے کی وجہ کچھ اور تھی۔ شمس علی ہلکان تھا کہ اپنے اس قیمتی خزانے کو کیسے کسی اور کی دسترس میں جانے سے بچائے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس دولت کے لٹ جانے کا خدشہ بڑھتا جا رہا تھا۔ حسینہ آج پھر ٹھیکیدار کے بیٹے کی گاڑی میں گھر لوٹی تھی اور شمس علی کی نظروں نے پھر وہ منظر دیکھا تھا جس کی کھولن وہ اپنے پورے وجود میں محسوس کرتا تھا۔

☆☆☆

کنول کے گھر پہنچنے والا اپائنٹمنٹ لیٹر ایک غیر متوقع خوشی کے مانند تھا۔ تین سوالوں پر مشتمل انٹرویو سے کنول نے قطعی کوئی امید نہیں باندھی تھی۔ وہ تو انٹرویو دینے بھی محض اس لیے چلی گئی تھی کہ مطلوبہ اہلیت نہ رکھنے کے باعث جب اسے ریجیکٹ کیا جاتا تو وہ ان لوگوں سے فیکٹری میں کسی اور جاب کے لیے اپنے تقرر کی درخواست کرتے ہوئے قسمت آزمائی کرتی لیکن باوجود خواہش کے انٹرویو لینے والوں کے سامنے اس کی زبان نہیں کھل سکی تھی۔ فیکٹری کے مالک کے رویے نے اسے بری طرح کنفیوژ کر دیا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بری طرح گھورنے لگا تھا مگر یہ گھورنا ویسا نہیں تھا جس سے کنول کو کسی بدنیتی کا احساس ہوتا۔ کم عمر ہونے کے باوجود وہ عورتوں کی مخصوص حس کے تحت خود پر پڑنے والی نظروں کا انداز بھانپنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ اس شخص کے گھورنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کنول کو دیکھ کر اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو اور پہچان نہ پا رہا ہو۔ کنول کو اس بات پر حیرت تھی کیونکہ وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا اور فیکٹری کے مالک کا زندگی میں کبھی بھی ایک دوسرے سے سامنا نہیں ہوا۔ سامنا ہونے کا سوال

ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ایک فیکٹری کے مالک اور سبزی فروش کی بیٹی کا حلقۂ احباب یقیناً قطعی مختلف تھا چنانچہ یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کا کہیں کسی محفل میں ایک دوسرے سے ٹکراؤ ہوا ہو۔ کنول البتہ غائبانہ طور پر کسی حد تک معظم سے متعارف تھی۔ اس کے محلے میں ہی رہنے والی ایک لڑکی کوثر اپنی شادی سے قبل اس فیکٹری میں بطور سپروائزر نوکری کرتی رہی تھی۔ دورانِ ملازمت کوثر کی زبان سے اپنے فیکٹری کے مالک معظم کے لیے تعریفی کلمات ادا ہوتے رہتے تھے۔ ملازمین کو وقت پر تنخواہوں کی ادائیگی سے لے کر معظم کی ذاتی شرافت تک کے قصے کنول نے کوثر کی زبان سے سن رکھے تھے چنانچہ جب اس نے اخبار میں ''ضرورت ہے'' کے کالم میں اس فیکٹری میں سیکریٹری کی جاب کے بارے میں پڑھا تو زیادہ سوچ بچار کیے بغیر وہاں جا پہنچی اور اب حیرت انگیز طور پر اس کا تقرر بھی ہو چکا تھا۔

''کنول باجی! تنخواہ ملتے ہی سب سے پہلے آپ مجھے نیا یونیفارم دلائیے گا۔ سچ بڑی شرم آتی ہے اس پھٹے پرانے یونیفارم کو پہن کر اسکول جاتے ہوئے۔'' کنول سے چھوٹی سنبل نے، جو کنول کو نوکری مل جانے کی نوید سن کر خود بھی بے حد خوش تھی فوراً ہی فرمائش جڑی۔ ''جی نہیں۔ کنول باجی پہلے مجھے جوتے دلائیں گی۔ ویسے بھی تمہارا تو اب اسکول میں آخری سال ہے۔ تم کیا کرو گی نیا یونیفارم لے کر؟'' بارہ سالہ جواد نے فوراً ہی سنبل کی مخالفت کرتے ہوئے اپنی فرمائش بیان کی۔

''آخری سال ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں پورا سال وہ سڑا بھسا یونیفارم پہن کر اسکول جاتی رہوں۔ بس میں نے بتا دیا ہے کہ مجھے نیا یونیفارم لینا ہے تم اپنے جوتے اگلی تنخواہ پر لے لینا۔'' سنبل نے بھی جیسے اٹل فیصلہ سنایا۔

''ارے کم بختوں! پہلے تنخواہ کی نوبت تو آنے دو۔ ابھی بہن نوکری پر پہنچی نہیں ہے اور یہ لگے ہیں لڑائیاں کرنے۔ جیسے کل فیکٹری جاتے ہی وہ لوگ سب سے پہلے تمہاری بہن کے ہاتھ پر تنخواہ ہی رکھیں گے۔'' سر پر پٹی باندھے لیٹی درد سے نڈھال ہوتی ان کی ماں سے زیادہ دیر یہ بحث برداشت نہ ہو سکی اور اس نے ان دونوں کے لتے لینے شروع کر دیے۔

''رہنے دیں نا امی! بچے ہیں پھر ایسی غلط فرمائشیں بھی نہیں کر رہے۔ میں خود کتنے دنوں سے محسوس کر رہی ہوں کہ انہیں ان چیزوں کی ضرورت ہے۔'' کنول نے نرمی سے ماں کو ٹوکتے ہوئے بہن بھائی کی سائڈ لی۔

''اب اتنے بھی بچے نہیں کہ گھر کے حالات نہ سمجھ سکیں۔ یہ سنبل تو تم سے تین، ساڑھے تین سال ہی چھوٹی ہے مگر سمجھ عقل نام کو نہیں۔'' ماں کی اس بات پر کنول نے خاموشی اختیار کر لی۔ سنبل اور جواد بھی شرمندہ شرمندہ سے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ یہ سچ تھا کہ گھریلو حالات واقعی اس نہج پر آ پہنچے تھے کہ اس قسم کی ضروریات کو پورا کرنا بھی عیاشی میں شمار ہونے لگا تھا۔ پانچ سال قبل باپ کی زندگی میں ان لوگوں کو اتنی محرومیوں کا سامنا نہیں تھا۔ بلکہ نہیں، معاملہ چھ سال قبل بگڑا تھا۔ جب دمے کا پرانا مرض ان کے باپ منیر احمد کو چارپائی پر لے آیا تھا۔ ایک سال کا عرصہ منیر احمد نے چارپائی پر پڑے پڑے گزارا تھا۔ اس عرصے میں کمائی کا ذریعہ ختم ہونے کے ساتھ ساتھ، جمع پونجی بھی ٹھکانے لگ گئی تھی۔

منیر احمد کے گزرنے کے بعد ان کی ماں نے سلائی مشین سنبھالی تھی۔ ماں کے اس ہنر کے سبب ہی گھر کا چولہا بھی روشن رہا تھا اور ان بھائی بہنوں کا تعلیمی سلسلہ بھی، بھلے سرکاری اداروں میں ہی سہی جاری رہا تھا۔ کچھ امداد ماموؤں کی طرف سے بھی مل جاتی تھی۔ بڑے ماموں دبئی میں تھے۔ چھ آٹھ ماہ میں ان کی طرف سے چھوٹی موٹی رقم کا ڈرافٹ مل جاتا تھا۔ چھوٹے ماموں جنہوں نے ابا کے انتقال کے بعد ان کی سبزی کی دکان سنبھالی تھی ان کے بعد دو سال تک ماہانہ کچھ رقم پابندی سے دیتے رہے تھے۔ پھر ماموں کی، ماں نے شادی کروا دی۔ چھوٹے ماموں جوان لوگوں کے ساتھ ہی رہتے تھے، شادی کے چھ ماہ بعد ان سے الگ ہو گئے۔ الگ ہونے کے بعد ماہانہ دی جانے والی خرچے کی رقم پہلے سہ ماہی اور ششماہی پر پہنچی اور پھر یہ سلسلہ ہی بند ہو گیا۔ ماموں کے پاس معقول بہانہ تھا کہ اب ان کے اپنے بیوی بچے ہیں اور ان کے لیے اپنے اخراجات پورے کرنا ہی مشکل ہوتا ہے تو وہ بہن اور اس کے بچوں کی امداد کیونکر کریں۔ بے چاری بہن یہ بھی نہیں جتا سکی تھی کہ امداد بے شک نہ کرو لیکن اس دکان کا کرایا دے دیا کرو جو میرے شوہر کی ملکیت ہے اور جس پر تم مزے سے قبضہ کیے بیٹھے ہو۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی سے اس کی سلائی مشین کا پہیا کہاں تک مقابلہ کرتا۔ جبکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ محنت کی زیادتی اس کے قویٰ کو کمزور کرتی جا رہی تھی رفتہ رفتہ گھریلو حالات ابتری کا شکار ہوتے چلے گئے۔ شکر یہ تھا کہ اس عرصے میں کنول نے بی۔ اے کا امتحان دینے کے ساتھ ساتھ ٹائپنگ اور کمپیوٹر کا ایک چھوٹا

مونا کورس بھی کرلیا تھا اور گھریلو حالات کے سدھار کے لیے نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہوگئی تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی یہ تلاش جلد ہی تمام ہوگئی۔ اب وہ مطمئن تھی کہ جلد اس قابل ہوجائے گی کہ گھر کی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ چھوٹے بھائی اور بہن کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو پورا کرسکے۔

☆☆☆☆

معظم کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور کھڑی تھی۔ زندگی کی بہت سی سختیوں کو کشادہ دلی سے سہہ جانے والا معظم اپنے رتجگوں کا حل کبھی نہیں ڈھونڈ پایا تھا۔ آج وہ جس حیثیت کا مالک تھا یہ حیثیت اسے باپ دادا کی طرف سے طشتری میں رکھ کر پیش نہیں کی گئی تھی۔ خود کو اس مقام تک پہنچانے کے لیے اس نے دن رات تگ ودو کی تھی۔ وہ دن میں کئی کئی گھنٹے بے تکان کام کرنے کے بعد اپنے موجودہ مقام پر پہنچا تھا یا پھر شاید بات یہ تھی کہ وہ اس مقام تک پہنچ ہی اس لیے گیا تھا کہ اس نے کام کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ درحقیقت اس نے اس مقام کو پانے کی کبھی بہت زیادہ خواہش نہیں کی تھی لیکن ''لاحاصل'' کی اذیت سے بچنے کے لیے اختیار کی جانے والی مصروفیات سے اسے بہت کچھ ''حاصل'' ہوگیا تھا۔ اس حاصل میں سرفہرست وہ گارمنٹس فیکٹری تھی جس کا وہ آج بلاشرکت غیر مالک تھا۔ فیکٹری کی ساکھ بہت اچھی تھی۔ وہ لوگ لوکل مارکیٹ میں مال سپلائی کرنے کے ساتھ ساتھ ایکسپورٹ بھی کیا کرتے تھے۔ مجموعی طور پر معظم ایک بہت کامیاب انسان تصور کیا جاتا تھا جس نے اپنے بل بوتے پر اتنی ترقی کی تھی لیکن خود معظم کا دل سچی خوشی کے احساس سے عاری تھا اور آج یہ احساس کنول کو دیکھ کر دوچند ہوگیا تھا۔ کنول نے پہلی نظر میں ہی اس کے دل کو اپنی طرف کھینچا تھا۔ معظم کا دل چاہا تھا کہ وہ اس لڑکی کو اپنے سامنے بٹھا کر بس دیکھتا ہی چلا جائے۔ شاید اسی خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے مطلوبہ اہلیت پر پورا نہ اترنے کے باوجود کنول کو اپنی سیکریٹری کی پوسٹ پر اپائنٹ کرلیا تھا۔ اپنا یہ رویہ اس کے لیے حیران کن تھا وہ کبھی بھی دل پھینک آدمی نہیں رہا تھا۔

اس کی نوجوانی کے دنوں کی بھی بس ایک ہی رنگین یاد تھی جسے وہ بیس سال کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد فراموش کرچکا تھا۔ پھر اس ''شاذ'' کو یاد بنائے رکھنے کے لیے اس کے پاس کوئی معقول وجہ بھی تو نہیں تھی۔ مختصر عرصے پر محیط نوجوانی کی وہ محبت زبان سے اظہار کا مرحلہ طے ہونے سے قبل ہی بہت تیزی سے اس کی زندگی سے خارج ہوگئی تھی۔ اس کے بعد حالات نے کبھی معظم کو اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ وہ اس لطیف جذبے کو محسوس کرپاتا۔ مگر اب بیس سال بعد جبکہ وہ اپنی عمر کے تینتالیس سال گزار چکا تھا کنول منیر کو دیکھ کر اس کے دل پر وہی مانوس سی دستک ابھری تھی جس کی وہ اس عمر میں قطعی توقع نہیں کررہا تھا۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ کنول کو دیکھتے ہی دل میں ابھرنے والا احساسِ شناسائی دراصل کنول کے چہرے کے لیے نہیں بلکہ اس دستک کے لیے تھا جو برسوں بعد اس نے سنی تھی۔ اس دستک پر معظم نے بہت تیزی سے ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے کنول کے لیے دروازے وا کردیے تھے لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ شاید اس سے غلطی ہوئی ہے۔ عمر کے اس حصے میں جبکہ وہ خود ایک جوان ہوتی ہوئی بیٹی کا باپ تھا اسے خود سے تیئس، چوبیس سال چھوٹی لڑکی کے لیے ایسی بے تابی دکھانے سے گریز کرنا چاہیے تھا۔ اس عمر میں اس قسم کی جذباتیت جگ ہنسائی اور رسوائی کا سبب بھی بن سکتی تھی لیکن اب کیا، کیا جاسکتا تھا۔ کنول کو اس کی ہدایت پر اپائنٹمنٹ لیٹر بھجوایا جاچکا تھا۔ یقیناً آنے والی صبح معظم اسے اپنے آفس کے ساتھ والے کیبن میں دیکھتا۔ اس صورتِ حال سے بچنے کی بس ایک ترکیب تھی کہ معظم کل کنول کے آنے پر اسے اپنی سیکریٹری کی جگہ دینے سے معذرت کرلے اور فیکٹری میں کسی اور معقول جاب کی آفر کردے۔ اس طرح وہ ہر گھڑی کنول کا سامنا کرنے سے بچ سکتا تھا۔ اس فیصلے پر پہنچ کر معظم نے قدرے اطمینان محسوس کیا اور بیڈ کی سائڈ دراز میں سے نیند کی گولیوں کی شیشی نکال کر اس میں سے ایک گولی پانی کی مدد سے نگل لی۔ اب وہ اپنے تھکے ہوئے جسم کے لیے کچھ دیر آرام کا خواہاں تھا لیکن گولی حلق سے نیچے جاتے ہی بستر پر اس کے بائیں جانب موجود وجود میں ہلچل سی ہوئی۔ بائیں جانب موجود وہ عورت اس کی بیوی تھی جو کھانسی کے شدید ترین دورے کے سبب سوتے سے اٹھ بیٹھی تھی۔ معظم نے اس کی ابتر ہوتی حالت پر دکھ محسوس کرتے ہوئے سائڈ میں رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر اس کے لبوں سے لگایا اور اس کی پشت کو بائیں ہاتھ سے سہلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی حالت سنبھل گئی۔

''تمہاری کھانسی دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔ کتنی بار میں نے تم سے کہا ہے کہ ڈاکٹر انصاری سے اپنا مکمل چیک اپ کروالو لیکن تم میری بات پر توجہ ہی نہیں دیتی ہو کل میں خود ان سے اپائنٹمنٹ لے کر تمہیں ڈرائیور کے ساتھ وہاں بھجواؤں گا۔'' پانی کا گلاس واپس جگہ پر رکھتے ہوئے معظم

نے خفا سے لہجے میں بیوی سے کہا تو وہ بجھے بجھے انداز میں مسکرادی اور پھر بولی۔

''آپ فضول میں پریشان ہورہے ہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ذرا سا کھانے کے ساتھ اچار کھالیا تھا اس لیے گلے میں خراش پڑگئی۔ اسی کی وجہ سے کھانسی ہورہی ہے۔ ایک آدھ دن میں ٹھیک ہوجائے گی۔''

''یہ بہانے میں بہت عرصے سے سن رہا ہوں کہ یہ کھالیا تھا تو کھانسی ہوگئی، وہ پی لیا تھا تو کھانسی ہوگئی لیکن اب مجھے ان بہانوں پر یقین نہیں آتا۔ تم کتنا کھانے پینے والی ہو اس کا اندازہ تمہیں دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے۔ بلکہ تم خود بھی یہ بات سمجھتی ہو کہ ان گزرے برسوں میں تمہارا حال کیا سے کیا ہوچکا ہے؟'' معظم بدستور خفا تھا۔ شاید کچھ اس لیے بھی مزاج زیادہ برہم ہورہا تھا کہ اب جبکہ وہ سونے کا ارادہ رکھتا تھا تو، مجبوری کے باعث جاگنا پڑ رہا تھا۔

''آپ آج ابھی تک سوئے کیوں نہیں؟ ساڑھے چار بجنے والے ہیں۔ کیا سونے کا ٹائم ڈھائی تین سے آگے بڑھ کر اس وقت تک آپہنچا ہے؟'' وہ یقیناً اپنی ذات کو موضوعِ گفتگو بنانے سے گریزاں تھی اس لیے گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معظم سے پوچھنے لگی۔ ''میں سونے ہی لگا تھا۔ تمہاری کھانسی کی وجہ سے ڈسٹرب ہوگیا۔'' معظم نے منہ پھلا کر جواب دیا اور پھر واقعی یوں آنکھیں موند کر بستر پر لیٹ گیا جیسے شدید نیند آرہی ہو۔ معظم کے اس انداز پر وہ تھوڑا سا حیران ہوئی۔ باوجود اس سے کوئی خاص انسیت نہ رکھنے کے معظم ہمیشہ اس کے ساتھ بہت مروت سے پیش آتا تھا۔ آج کی یہ بے مروتی ظاہر کررہی تھی کہ واقعی وہ بہت تھکا ہوا تھا اور اسی کی وجہ سے بے آرام ہوا تھا۔ وہ چپکے سے بستر سے اتر کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اب وہ معظم کی نیند خراب ہونے کے خدشے سے بے نیاز ہوکر آرام سے کھانس سکتی تھی۔ یہاں اسے کوئی ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دینے والا بھی نہیں تھا۔ خود معظم کے بارے میں وہ جانتی تھی کہ اپنی بے تحاشا مصروفیت میں اسے آنے والی کل میں یہ بات یاد بھی نہیں رہے گی۔

☆☆☆☆

''ناجیہ! اچھی سی چائے بنالے، چھوٹے شاہ صاحب آئے ہیں میرے ساتھ اور ہاں دیکھ اظہر کو بھیج کر کرمو چاچا کی دکان سے بسکٹ بھی منگوالے۔ کبھی کبھار تو گھر میں قدم رکھتے ہیں وہ۔ خالی چائے پلانا بھلا کیا اچھا لگے گا۔'' آج شمس علی کے ہاتھ میں بہت تکلیف تھی تکلیف کی شدت سے بخار بھی چڑھ گیا تھا اسی وجہ سے وہ حسینہ کی واپسی کے اوقات میں حسبِ معمول کھڑکی میں کھڑا ہوکر نگرانی کا فرض انجام نہیں دے سکا تھا لیکن اس سے کوئی فرق بھی نہیں پڑا تھا۔ اسے چارپائی پر لیٹے لیٹے ہی علم ہوگیا تھا کہ حسینہ آج پھر ٹھیکیدار کے بیٹے کے ساتھ اس کی گاڑی میں گھر واپس آئی ہے اور صرف اس کے ساتھ آئی ہی نہیں ہے بلکہ اسے گھر کے اندر تک بھی لے آئی ہے۔ ٹھیکیدار کا بیٹا جسے سب چھوٹے شاہ صاحب کہہ کر پکارا کرتے تھے، ان کے گھر کے اندر تھا تو حسینہ کو شمس علی کی طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ وہ اس سے بے نیاز اس کے سرہانے بیٹھی ناجیہ کو ہدایات کے ساتھ پلو میں بندھے روپے تھما کر واپس اس کمرے میں چلی گئی تھی۔ جہاں چھوٹے شاہ صاحب بیٹھے تھے۔ ناجیہ نے بھی شمس علی کا سر دبانا ترک کرکے فوری طور پر حسینہ کی ہدایات پر عمل درآمد شروع کردیا تھا۔ کھڑکی میں سے گلی میں کھیلتے اظہر کو آواز دے کر بسکٹ لانے کی ذمے داری سونپ کر وہ خود پھرتی سے باورچی خانے میں جا گھسی تھی۔ شمس علی اس صورتِ حال پر بری طرح کڑھ رہا تھا۔ بیوی نے خود تو حال پوچھنے کی زحمت نہیں کی تھی اوپر سے خدمت کرنے والی بیٹی کو بھی اس کے پاس سے اٹھا کر لے گئی تھی۔ ہاتھ کی تکلیف، بخار کی کھولن اور غیرت پر لگنے والی ضرب کی اذیت سے نڈھال شمس علی کچھ دیر تو بستر پر بے بس سا پڑا رہا پھر ہمت کرکے اٹھا اور دوسرے کمرے میں کھلنے والے دروازے کے قریب جاکر اسے ذرا سا وا کرتے ہوئے کمرے میں جھانکا۔ ٹھیکیدار کا بیٹا کمرے میں موجود کل دو کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا ہوا تھا۔ حسینہ بھی دوسری کرسی پر اس کے قریب ہی بیٹھی تھی جبکہ ناجیہ جھکی جھکی آنکھوں سے ان دونوں کو چائے پیش کررہی تھی۔ شمس علی کو اپنی بیٹی کا اس طرح چھوٹے شاہ صاحب کی خدمت کرنا اچھا نہ لگا۔ ادھر حسینہ اس کے جذبات سے بے خبر لہجے میں حلاوت گھولے بڑے فدویانہ انداز میں چھوٹے شاہ صاحب سے کہہ رہی تھی۔

''چائے پیجیے چھوٹے شاہ صاحب! میری ناجیہ نے خاص طور پر آپ کے لیے بڑی محنت سے بنائی ہے۔ بڑی سلیقے والی اور فرمانبردار بچی ہے یہ۔ میری ہر بات مانتی ہے۔''

ناجیہ اپنی اس تعریف پر شرما کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

''تمہاری بات ماننے سے تو شاید ہی کوئی انکار کرتا ہو حسینہ بی! میں نے خود کتنوں کو دیکھا ہے جو تمہارے ایک

اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔ اصل بات تو تب ہے جب کوئی تم سے اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو جائے۔'' چھوٹے شاہ صاحب نے حسینہ کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرا دی۔ پھر ذرا معنی خیز انداز میں بولی۔

''ماننے والی بات میں بھی مان لینے کو تیار ہوں۔ آپ کو یقین نہ ہو تو آزما کر دیکھ لیں۔''

''آزمانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ میں تو اب تک صرف اس لیے صبر سے بیٹھا ہوں کہ بات کو طریقے سے وقت پر کہنے کا قائل ہوں۔ مناسب وقت آیا تو پھر ذرا دیر نہیں لگاؤں گا اپنی بات کہنے میں اور تمہیں بھی میری بات ماننی ہی پڑے گی۔'' چھوٹے شاہ صاحب کا لہجہ بھی معنی خیز تھا۔

''زہے نصیب۔'' حسینہ نے خوش دلی سے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ کواڑ پکڑ کر کھڑے شمس علی کو مزید ان کی باتیں سننے کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ واپس اپنی چارپائی پر آلیٹا۔ اس ذرا سی مشقت کے ساتھ جذبات میں اٹھنے والے جوار بھاٹے نے مل کر اسے ہانپنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چارپائی پر پڑا وہ دوسرے کمرے سے آتی آوازوں کو، جن میں حسینہ اور چھوٹے شاہ صاحب کی مدھم ہنسی بھی شامل ہو جاتی تھی، خود پر جبر کیے سنتا رہا۔ چھوٹا شاہ صاحب وہاں شاید پندرہ منٹ ہی بیٹھا ہوگا لیکن شمس علی کے لیے یہ پندرہ منٹ گزارنا بھی صدیوں کے انتظار کے برابر تھا۔

''آج تو تھک گئی بری طرح۔ بڑے صاحب کا آرڈر آگیا تھا کہ لاٹ آج ہی مکمل کرنی ہے۔ کام میں دوپہر کی روٹی کھانے کا بھی وقت نہیں ملا۔'' چھوٹے شاہ صاحب کے جانے کے بعد حسینہ اپنی لمبی چوٹی کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور چارپائی پر بیٹھ کر خود ہی اپنی ٹانگیں دبانے لگی۔ کچھ دیر قبل لہجے سے پھوٹنے والی شگفتگی کی جگہ اب اس کا پورا وجود شدید تھکن کا مظہر محسوس ہو رہا تھا۔ شمس علی کلس کر اسے دیکھنے لگا اس دیکھنے کے عمل میں اسے ایک بار پھر اعتراف کرنا پڑا کہ حسینہ غضب کی شے ہے جو کسی بھی بڑے سے بڑے زاہد کے ایمان کو ڈگمگا سکتی ہے۔ شمس علی کے حکم پر ساڑھی ترک کر کے شلوار قمیص پہننا شروع کرنے کے باوجود اس کے وجود کی رعنائیوں پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اب بھی ''حسینہ'' ہی تھی اور یہ بات شمس علی کا چین لوٹنے کے لیے کافی تھی۔

''کمال ہے کہ لوگ تجھ سے بھی کام کرواتے ہیں۔ تو چاہے تو لوگ خود تیری غلامی کرنے لگیں۔''

جلا بھنا شمس علی خود کو طنز کرنے سے باز نہیں رکھ سکا تھا۔

''مطلب کیا ہے اس بات کا؟'' حسینہ فوراً ہی چونکی اور چمک کر پوچھنے لگی۔

''مطلب مجھ سے کیا پوچھتی ہے؟ چھوٹے شاہ کو تو تو نے اپنا ڈریور (ڈرائیور) بنا رکھا ہے تو پھر اور کون ہے وہاں جو تجھ سے کام لیتا ہو۔'' شمس علی بھی زیادہ مروت کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے بنا لحاظ کے جتا گیا۔

''ادھر کام چھوٹے شاہ صاحب نہیں اس کے باپ کی مرضی سے ہوتا ہے اور چھوٹا شاہ صاحب بھی اگر کبھی کبھی مجھے گھر چھوڑ جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرا ڈریور بن گیا ہے۔ وہ تو اس کا اپنا مطلب ہے جو وہ مجھ پر یہ مہربانی کر دیتا ہے۔'' حسینہ نے شمس علی کی بات کا جواب دیا۔

''یہی تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا مطلب ہے اس کا تجھ سے؟ کیوں وہ تیری چاکری کرتا ہے؟''

شمس علی اب چارپائی پر اٹھ بیٹھا تھا اور غصے سے کپکپاتا حسینہ سے پوچھ رہا تھا۔

''وقت آنے پر تجھے بھی سارے مطلب پتا چل جائیں گے۔'' حسینہ کا موڈ شمس علی کے انداز پر خراب ہو گیا تھا چنانچہ وہ بھی کچھ غصے سے بولی۔

''وقت کے انتظار میں میری عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔ لوگ جانے کیسی کیسی باتیں بناتے ہوں گے تجھے اس کی گاڑی میں آتے دیکھ کر۔ انہیں تو یہی خیال آتا ہوگا نا کہ شمس علی ذرا سا معذور کیا ہوا اس کی عورت بالکل ہی آزاد ہو گئی۔'' شمس علی کے اندر کئی دنوں سے پکتا لاوا آہستہ آہستہ باہر آ رہا تھا۔

''لوگوں کی باتیں نہ کیا کرو میرے سامنے۔ اس وقت کہاں تھے یہ لوگ جب تمہارا ہاتھ کٹا؟ کیسے میں تنہا عورت ہر طرف بھاگتی پھرتی تھی؟ اس وقت تو کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا اور جب گھر میں فاقوں کی نوبت آنے لگی تھی تب کہاں تھے یہ لوگ؟ اپنی جوتی کی نوک پر رکھتی ہوں میں ایسے لوگوں کو۔ مجھے نہیں پروا ان لوگوں کی۔ میں تو وہ کروں گی جو مجھے اپنے اور اپنے بچوں کے حق میں اچھا لگے گا۔'' حسینہ اپنے مزاج کے برخلاف بری طرح بھڑک اٹھی اور شمس علی کو دو بدو جواب دے کر جھٹکے سے چارپائی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ شمس علی آنکھیں پھاڑے حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ حسینہ اتنی دیدہ دلیر ہو گئی ہے کہ اسے بھی خاطر میں لانے کو تیار نہیں۔ شاید اس کی یہ دیدہ دلیری شمس علی کی معذوری اور اپنی خود مختاری کے باعث تھی۔ حسینہ کی اس

دیدہ دلیری اور اپنی بے بسی کے تجزیے میں الجھے شمس علی کو احساس نہ ہو سکا کہ کتنے لمحے گزر چکے ہیں۔ وہ کمرے میں ابھرنے والی آہٹ پر اپنے خیالوں سے نکلا تو دیکھا حسینہ کچھ نادم نادم سی سامنے کھڑی تھی۔

''ناجیہ بتا رہی تھی کہ تمہاری طبیعت خراب ہے۔ ہاتھ میں صبح سے درد ہو رہا ہے اور بخار بھی چڑھ گیا ہے۔'' اب اس کا لہجہ بھی نرم تھا۔ شمس علی نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر منہ پھیر لیا۔

''غلطی ہو گئی مجھ سے۔ بیکار میں غصے میں آ گئی۔ کیا کروں دن بھر کی محنت اور لوگوں کی الٹی سیدھی باتوں سے طبیعت بیزار ہو جاتی ہے اس پر گھر آ کر بھی کچھ سننا پڑے تو متھا بالکل ہی گھوم جاتا ہے۔'' وہ اپنے رویے کی وضاحت پیش کر رہی تھی۔ شمس علی نے اس بار بھی کوئی جواب دینے کی زحمت نہ کی۔

''اچھا ٹھیک ہے مت بولو مجھ سے لیکن میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس تو چلو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تکلیف اور بڑھ جائے۔'' شمس علی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کرتی اب وہ وہی حسینہ تھی جو بڑے پیار سے شمس علی کے ناز اٹھاتی تھی۔

''کہیں نہیں جانا مجھے۔ پڑا رہنے دے یہیں۔ اچھا ہے ایک دن جان سے ہی چلا جاؤں تو پھر کوئی تجھے رونے ٹوکنے والا نہیں رہے گا۔'' شمس علی حسبِ معمول پگھلنے لگا تھا لیکن اوپری طور پر غصہ دکھا رہا تھا۔

''اچھا بابا! میری توبہ جو آئندہ کبھی چھوٹے شاہ صاحب کے ساتھ گاڑی میں آئی۔ اب تو تم غصہ چھوڑ دو اور میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو۔'' حسینہ نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے ہوئے وعدہ کیا تو شمس علی مسکرا دیا۔ یہ مسکراہٹ اس کے مان جانے کی علامت تھی۔ ''بس ہمیشہ نخرے ہی دکھاتے رہا کرو۔ جیسے مجھے تو تمہارے نخرے اٹھانے کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہے۔'' اسے مسکراتے دیکھ کر حسینہ بڑبڑانے لگی۔ اس بار اس کی یہ بڑبڑاہٹ شمس علی کو بری نہیں لگی۔ وہ کچھ دیر قبل ہونے والی تلخی کو فراموش کر کے حسینہ کے چہرے کو محبت پاش نظروں سے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

ریوالونگ چیئر پر بیٹھا معظم شیشے کے اس پار نظر آتے والی کنول پر نظریں جمائے بہت انہماک سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ان پُرشوق نظروں میں ایک خاص طرح کی نرمی تھی۔ وہ نرمی جو دل میں دوسرے فریق کے لیے موجود احترام کی صورت میں ہی نظروں سے جھلکتی ہے۔ معظم جرأت سے کام لیتے ہوئے خود سے اعتراف کرتا تو بات بہت واضح تھی وہ کنول کو محبت بھری نظروں سے تک رہا تھا۔ لیکن یہ اعتراف کرنا ہی تو آسان نہیں تھا۔ کیسے وہ اپنے اور اس کے درمیان دو عشروں سے بھی زیادہ طویل عمر کے فرق کو نظر انداز کر دیتا۔ پر اس کے تسلیم نہ کرنے سے کیا ہوتا تھا۔ جو وہ تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا وہ اس کی بے اختیاری خود تسلیم کروائی جا رہی تھی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت کنول کا اس کے آفس کے ساتھ والے کیبن میں موجود ہونا تھا۔ اپنے فیصلے کے مطابق وہ کنول کو اپنی سیکریٹری کی حیثیت سے ہٹ کر فیکٹری میں کوئی جاب آفر نہیں کر سکا تھا اور کنول نے اس کی سیکریٹری کی حیثیت سے کام شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں اس کی ٹریننگ جاری تھی۔ اس وقت بھی معظم دیکھ رہا تھا کہ منیجر افتخار کنول کے کیبن میں موجود ہے اور کنول کو کچھ سمجھا رہا ہے۔ کنول تھوڑی کے نیچے اپنا بال پوائنٹ رکھے اس کی بات غور سے سن رہی تھی۔ معظم نے نوٹ کیا تھا کہ کسی بات کو توجہ سے سمجھنے کے لیے یہ کنول کا مخصوص انداز تھا اور سچ یہ تھا کہ اس پر یہ انداز خوب سجتا بھی تھا۔ کنول کے اس انداز کو وارفتگی سے دیکھتے ہوئے معظم کو قطعی فکر نہیں تھی کہ کنول کے کیبن میں موجود منیجر اس کی یہ حرکت دیکھ سکتا ہے۔ دراصل معظم کے آفس اور کنول کے کیبن کے درمیان موجود گلاس وال کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ معظم تو کنول کی تمام حرکات و سکنات دیکھ سکتا تھا لیکن کنول کے کیبن سے معظم کے آفس کا منظر دیکھا جانا ممکن نہیں تھا۔ اس سہولت کا فائدہ اٹھا کر معظم آرام سے اپنے شوق کی تسکین کرتا رہتا تھا لیکن پھر اس عمل کے دوران ہی اس پر اچانک احساسِ ندامت طاری ہو جاتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ دل میں ابھرنے والے احساسِ ندامت نے اسے ریوالونگ چیئر کا رخ موڑ کر کنول پر سے نظریں ہٹانے پر مجبور کر دیا۔

''تم نہایت غلیظ آدمی ہو۔ شادی شدہ زندگی کے بیس سال گزارنے کے بعد تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ایک ان چھوئی کلیوں جیسی لڑکی کے لیے اس انداز میں سوچو؟ جانتے بھی ہو کہ خود تمہاری اپنی بیٹی چودہ برس کی ہو چکی ہے۔ یہ لڑکی جس کا نام کنول منیر ہے اور جس کے حلیے سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے گھریلو حالات سے مجبور ہو کر تمہارے آفس تک آئی ہے، تمہاری بیٹی سے چار پانچ برس ہی بڑی ہوگی۔ اگر تم شادی کے پہلے برس ہی باپ بن جاتے تو تمہاری بیٹی اور یہ لڑکی بالکل ہم عمر ہوتیں۔ اپنی بیٹی کی عمر کی کسی لڑکی کو اس انداز میں دیکھنا اور اس کی خواہش پالنا گھٹیا پن کے سوا کچھ نہیں۔''

کنول کی طرف سے رخ موڑنے کے بعد حسبِ معمول معظم نے خود کو لعن طعن کرنے کا وہ سلسلہ بھی شروع کر دیا جس کے سہارے وہ اتنے دنوں سے کنول کے لیے اپنے دل میں ابھرنے والے جذبوں پر بند باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ بند جذبوں کی شورش کے آگے کتنے عرصے ٹھہرا رہتا۔ معظم اس وقت سے خوفزدہ تھا جب اس بند میں شگاف پڑتا اور اس کے دل میں موجود جذبے سیل رواں کی طرح بہ نکلتے۔ وہ ہر حال میں اس سیل رواں کو روکنا چاہتا تھا کہ بیس سال پہلے بھی بہت سی بدنامی اور رسوائی کو سہہ چکا تھا۔ بیس سال پہلے جوانی کے جوش میں اس نے بہت ہی خراب صورتِ حال کا مقابلہ پوری طرح ڈٹ کر کرلیا تھا لیکن اب..... اب جانے وہ اس بوجھ کو اٹھانے کا متحمل ہو بھی پاتا یا نہیں؟

☆☆☆

معظم کے اندازے کے برخلاف کنول اس کی نظروں کی چوری سے واقف تھی۔ اول روز ہی اس نے یہ بات محسوس کرلی تھی کہ کوئی اسے مسلسل دیکھ رہا ہے۔ وہ ''کوئی'' کوئی بھی ہوسکتا تھا۔ شیشے کی دیواروں والے اس کیبن میں بیٹھ کر وہ ہر ایک کی ہی نظروں کی رسائی میں تھی۔ اول اول اس نے کوشش کی کہ اس بات کو نظر انداز کر دے لیکن نظر انداز کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ مسلسل دیکھے جانے کا احساس اس کے کام میں بھی حارج ہوتا تھا۔ چنانچہ کنول نے نظروں سے نقب لگانے کی کوشش کرنے والے اس چور کو پکڑنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بہ ظاہر کام میں منہمک رہتے ہوئے وقفے وقفے سے دزدیدہ نظروں سے اپنے اطراف کا جائزہ لیتی رہتی۔ دو چار دنوں میں ہی اس پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وہاں کام کرنے والے اسٹاف ممبر میں سے کوئی بھی بطورِ خاص اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ ان میں سے کوئی کنول کی طرف دیکھتا بھی تو اچٹتی ہوئی، عام سی نظروں سے جبکہ کنول کے اندر ابھرنے والا احساس اسے بتاتا تھا کہ دیکھنے والا اسے مسلسل دیکھتا ہے۔

بالآخر کنول کا دھیان اپنے ساتھ موجود معظم کے آفس کی طرف گیا اور وہ دھک سے رہ گئی۔ واقعی اسے یہ خیال تو سب سے پہلے آنا چاہیے تھا۔ معظم تو وہ شخص تھا جو پہلی ملاقات کے دوران بھی اسے مسلسل گھورتا رہا تھا۔ کنول کا دھیان نہ جانے کی وجہ شاید یہ تھی کہ خود اس کے اپنے کیبن سے معظم کا آفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ نظر نہیں آتا تھا تو کنول نے بھی نہیں سوچا کہ اسے یوں دیکھنے والا معظم ہوسکتا ہے۔ دھیان آنے پر اس نے اس معاملے پر مزید غور و خوض شروع کر دیا اور بات آہستہ آہستہ واضح ہوتی چلی گئی۔ کنول کے اندر خود کو دیکھے جانے کا احساس صرف اسی وقت ابھرتا تھا جب معظم اپنے آفس میں موجود ہوتا۔ اس کی غیر موجودگی میں کنول نے کبھی اس چیز کو محسوس نہیں کیا تھا۔ اس سلسلے میں اسے اپنی چھٹی حس پر ذرا بھی شبہ نہیں تھا۔ وہ تو اب یہ بھی بتا سکتی تھی کہ اپنے آفس میں موجودگی کے دوران بھی معظم کب اسے دیکھ رہا ہوتا تھا اور کب نہیں۔ کمال کی بات یہ تھی کہ اسے معظم کا خود کو یوں دیکھنا کبھی برا بھی نہیں لگا تھا۔ وہ اس کی اس حرکت پر کبھی ناگواری محسوس نہیں کرتی تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کا جب معظم سے آمنا سامنا ہوتا تو اس وقت وہ معظم کی نظروں کے انداز کو پرکھنے کی کوشش کیا کرتی۔ تجربہ کار نہ ہونے کے باوجود اسے اپنی پرکھ کے نتائج پر اعتماد تھا۔ اسے یقین تھا کہ معظم کی اس پر اٹھنے والی نگاہوں میں آلودگی کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے دیکھتا ضرور تھا لیکن اس دیکھنے کے پیچھے کسی سفلی جذبے کے بجائے نرم و ملائم، ہلکی ہلکی آنچ دیتے نہایت خوبصورت جذبے کارفرما ہوتے تھے۔ معظم کے ان جذبوں کی آنچ کنول تک پہنچنے لگی تھی۔ وہ اپنے اندر ایک بے نام سی خوشگوار تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ اس تبدیلی کو اس نے بہت خاموشی سے قبول کرلیا تھا۔ نہ وہ معظم کی طرح اپنے آپ سے بھڑکی تھی اور نہ ہی حیثیت و عمر کے فرق کو بنیاد بنا کر خود کو لعن طعن کی کوشش کی تھی۔ اس کے لیے تو یہ احساس ہی کافی تھا کہ اس کی ذات معظم کے جذبوں کا مرکز ہے۔ وہ زندگی میں پہلی بار چاہے جانے کے تجربے سے گزر رہی تھی اور چاہنے والا بھی وہ تھا جس کی ذات میں کنول کو کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ خوبصورت، مہذب، صاحبِ امارت، مہربان و با اخلاق معظم میں کم از کم کنول کو کوئی کمی نظر نہیں آتی تھی۔ عمر کے اعتبار سے وہ بے شک اس سے بہت بڑا تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ معظم اپنی اصل عمر سے کہیں کم نظر آتا تھا۔ عمر کے جو اثرات اس پر ظاہر تھے ان کی اثر انگیزی بھی بڑی مثبت تھی۔ وہ باوقار، سنجیدہ اور پُرکشش دکھائی دیتا تھا۔ ایسے میں کنول کو اس کی ذات میں کوئی کمی کیونکر نظر آتی؟

☆☆☆

شمس علی قدرے پُرسکون ہو چلا تھا۔ اس کے منع کرنے کے بعد حسینہ دوبارہ چھوٹے شاہ کے ساتھ اس کی گاڑی میں گھر واپس نہیں آئی تھی۔ اس کی اس فرمانبرداری نے شمس علی کو خوش کر دیا تھا۔ خوشی کے باعث اس کا موڈ بہت

اچھا رہنے لگا تھا۔ مزاج کی یہ تبدیلی طبیعت کے لیے بھی مثبت ثابت ہوئی تھی۔ نہ تو اتنے دنوں سے اس کے ہاتھ میں درد اٹھا تھا اور نہ ہی کسی اور قسم کی شکایت پیدا ہوئی تھی۔ گھر کا ماحول اچھا خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔ بچے جو شمس علی کو بے آرامی سے بچانے کے لیے حسینہ کی ہدایت پر بہت احتیاط سے کام لیتے تھے کھلے کھلے سے محسوس ہونے لگے تھے۔ اب ان کی ہنسنے کھیلنے کی آوازوں پر نہ تو شمس علی چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتا تھا اور نہ ہی حسینہ اور ناجیہ ٹوکتی تھیں۔ گھر کی فضا معمول پر آ گئی تھی۔ شمس علی بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھ کر ہنسی مذاق بھی کرنے لگا تھا۔ کل ہی کی بات تھی جب حسینہ ان لوگوں کے لیے بازار سے کچھ خریداری کر کے لائی تھی۔ سردیوں کی آمد آمد تھی چنانچہ اسی اعتبار سے اس نے سب کے لیے چیزیں لی تھیں۔ دونوں بیٹوں کے لیے سوئٹر، شمس علی کے لیے مفلر اور گرم جرابیں، ناجیہ کے لیے شال اور جوڑا اور خود اپنے لیے بھی ایک شال لے کر آئی تھی وہ۔ تمام چیزیں بڑی عمدہ اور خوبصورت تھیں۔ حسینہ کے مطابق اس نے اپنی ایک سہیلی کی مدد سے لنڈا بازار سے بہت چھان پھٹک کر یہ چیزیں خریدی تھیں۔ صرف ناجیہ کا جوڑا ایسا تھا جو لنڈا بازار کے بجائے کسی اور جگہ سے خریدا گیا تھا۔ ناجیہ اپنا جوڑا اور شال دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ خوش تو دونوں بیٹے اور شمس علی بھی تھے۔ شمس علی نے تو بلکہ اتنی عمدہ خریداری کرنے پر حسینہ کو داد بھی دی تھی۔ اس کی لائی ہوئی کوئی بھی چیز تو لنڈا بازار کی نہیں لگ رہی تھی۔ حسینہ شمس علی کی زبان سے اپنی تعریف سن کر بے حد خوش ہوئی تھی۔ وہ دونوں رات کو بچوں کے سونے کے بعد بھی بہت دیر تک جاگتے رہے تھے۔ گزشتہ عرصے کی ساری تلخی جیسے یکدم ہی مٹ گئی تھی۔ شمس علی کی حسینہ سے ساری شکایتیں ختم ہو گئی تھیں۔ آج بہت دنوں بعد ایسا تھا کہ وہ حسینہ کی نگرانی کے بجائے اس کی راہ دیکھنے کے لیے بار بار کھڑکی میں جا کھڑا ہوتا تھا۔ حالانکہ ابھی حسینہ کے واپس آنے میں بہت وقت پڑا تھا مگر دل کی بے چینی ان باتوں کو سمجھتی ہی کہاں ہے؟ ساڑھے تین بجے کے قریب شمس علی نے ایک بار پھر کھڑکی سے گلی میں جھانکا۔ حسینہ تو ظاہر ہے اس بار بھی وہاں نہیں تھی لیکن شمس علی کو اپنا ایک دوست افضل نظر آ گیا۔ افضل نے بھی اسے دیکھ لیا اور دور ہی سے پکارا۔

''اور یار شمسو! کیسا ہے تو؟ طبیعت تو ٹھیک چل رہی ہے تیری؟''

''اللہ کا کرم ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ آ اندر آ جا بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' شمس علی نے افضل کو پیشکش کی۔ حسینہ کے انتظار کا ایک ڈیڑھ گھنٹا افضل سے گپ شپ لگانے میں آسانی سے گزر سکتا تھا۔ افضل بھی یقیناً فارغ تھا اس لیے فوراً ہی شمس علی کی پیشکش قبول کرتے ہوئے اندر آ گیا۔

''اور سنا کیا حال چال ہے؟ گھر کے معاملات تو ٹھیک چل رہے ہیں؟'' شمس علی کے ساتھ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے افضل نے بے تکلفی سے پوچھا۔

''بس مولیٰ کا کرم ہے۔'' شمس علی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر قدرے افسردگی سے بولا۔ ''میں تو اس حادثے کے بعد سے تقریباً ناکارہ ہو گیا ہوں۔ کہنے کو صرف ایک ہاتھ کٹا ہے لیکن آئے دن کی تکلیف اور دوسری چھوٹی موٹی بیماریوں کی وجہ سے کوئی بھی محنت کا کام کرنے کے قابل نہیں رہا۔ یہ تو تیری بھابی کی ہمت ہے کہ وہ مردوں کی طرح گھر چلانے کے لیے محنت کرتی ہے۔ کمانے کے ساتھ باہر کے کئی دوسرے کام بھی اس بیچاری کے سر پر پڑ گئے ہیں۔'' حسینہ کی طرف سے کل ہی ہونے والے تجدید محبت کے باعث شمس علی بہت کھل کر اس کی خدمات کا اعتراف کر رہا تھا۔

''بس یار! یہ بھی سارے قسمت کے کھیل ہیں۔ مرد کی معذوری عورت کو چار دیواری سے باہر آنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ کل دیکھا تھا میں نے تیری گھر والی کو بازار میں ایک لڑکے کے ساتھ۔ شاید گھر کے لیے ہی سامان خرید رہی ہو گی۔'' افضل کی بات شمس علی کو بچھو کے ڈنک کی طرح لگی۔ حسینہ نے تو کہا تھا کہ وہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ بازار گئی تھی اور افضل اس کے کسی لڑکے کے ساتھ دکھائی دینے کا ذکر کر رہا تھا۔

''حسینہ کس لڑکے کے ساتھ بازار گئی تھی؟'' اندر کی سوچ بے خیالی میں ہی اس کے ہونٹوں پر آواز بن کر ابھری۔

''تھا ایک لمبا سا، گورا سا لڑکا۔'' افضل نے اس کی بات کے جواب میں بتایا۔ پھر اچانک ہی کچھ یاد آ جانے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ ''ارے وہی لڑکا نا، جس کے ساتھ اس کی موٹر میں بھی کبھی کبھی بھابی گھر آتی ہے۔'' افضل کے ان الفاظ نے شمس علی کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ افضل سے ملنے والی اطلاع کا مطلب تھا کہ حسینہ نے صرف ظاہری طور پر اسے دکھانے کے لیے چھوٹے شاہ کے ساتھ آنا جانا چھوڑا تھا ورنہ اس کی بے خبری میں وہ اب بھی اس کے ساتھ سیر سپاٹے کرتی پھر رہی تھی۔

''اچھا یار! اب میں چلتا ہوں۔ بڑی دیر ہو گئی۔'' افضل جس کی آمد کا اصل مقصد ہی شمس علی کو یہ اطلاع دینا تھا، شمس علی کے چہرے پر چھائی ہوئی سرخی کو دیکھتا ہوا مزے

سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شمس علی نے بھی اسے مزید رکنے کو نہیں کہا۔ وہ تو صرف یہ سوچ سوچ کر ہی کھولے جا رہا تھا کہ اگر اس نے اتفاقاً افضل کو آواز دے کر اندر نہ بلایا ہوتا تو اسے اتنی اہم اطلاع نہ ملتی۔ اپنی طرف سے حسینہ تو اسے جل دے ہی گئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ افضل اس کے پکارے بغیر بھی اس کے پاس ضرور آتا۔ حسینہ پروار کرنے کا اتنا اہم موقع وہ آخر کیسے جانے دیتا؟

☆☆☆

معظم حسب معمول شیشے کی دیوار کے اس پار نظر آنے والی کنول کو دیکھ رہا تھا۔ وہ فون کا ریسیور کان سے لگائے کسی سے بات کر رہی تھی۔ پھر اس کی انگلیوں کی جنبش نے معظم کو بتایا کہ وہ آنے والی کال اسے ٹرانسفر کر رہی ہے۔ اگلے ہی لمحے اس کی ٹیبل پر رکھا ہوا فون بج اٹھا۔ معظم نے ریسیور اٹھایا۔

"سر! مسٹر قریشی آپ سے بات کریں گے۔" کنول کی مدھر آواز معظم کے کان میں گونجی۔ پھر قریشی صاحب لائن پر آ گئے۔ قریشی صاحب اس کی گارمنٹ فیکٹری کو کپڑا سپلائی کیا کرتے تھے۔ انہوں نے کپڑے کی سپلائی سے متعلق ہی کوئی بات کرنے کے لیے معظم کو فون کیا تھا۔ ان سے بات کرنے کے دوران بھی معظم کنول کا جائزہ لیتا رہا۔ اسے ایک بار پھر وہ احساس ہوا جو آج کنول پر پہلی نظر پڑتے ہی ہوا تھا۔ کنول کچھ بجھی ہوئی اور پریشان دکھائی دیتی تھی۔ اس کی اس کیفیت پر معظم خود اپنے اندر اضطراب محسوس کرنے لگا۔ اپنے اندرونی اضطراب کے باعث اس نے قریشی صاحب کے فون بند کرتے ہی کنول کو انٹرکام پر اپنے آفس میں آنے کی ہدایت دی۔ کنول فوراً حاضر ہو گئی۔ مگر اب معظم سوچ رہا تھا کہ اس سے کیا کہے۔ براہِ راست یہ پوچھنا کہ آج تم پریشان کیوں نظر آ رہی ہو! خود اسے مشکوک بنا دیتا۔ اس کے اس سوال پر لازماً کنول کے دل میں یہ خیال آتا کہ معظم اپنے آفس میں بیٹھا اس کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ معظم اپنی اس چوری کو کنول کے علم میں نہیں لانا چاہتا تھا چنانچہ اسے اپنے آفس میں کال کرنے کا ایک معقول سبب ڈھونڈ نکالا اور کاروباری نوعیت کا ایک لیٹر ڈکٹیٹ کروانے لگا۔ کنول اس کے سامنے بیٹھی خاموشی سے ڈکٹیشن لیتی رہی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ پریشان ہے۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے مس کنول؟" بالآخر معظم اس سے پوچھ بیٹھا۔

"یس سر!" کنول نے تیزی سے اس کی بات کا جواب دیا۔ معظم کو اندازہ ہوا کہ اگر وہ اس سے کسی اور زاویے سے بھی احوال جاننے کی کوشش کرے گا تو وہ اپنا مسئلہ اسے بتانے سے گریز کرے گی۔ چنانچہ اس سلسلے میں مزید کوئی سوال کیے بغیر معظم نے ڈکٹیشن مکمل کروا کر اسے لیٹر ٹائپ کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے اپنے آفس سے جانے کی اجازت دے دی۔ اب وہ خود کنول کے مسئلے پر غور کر رہا تھا۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں جھماکا ہوا بات بالکل سامنے کی تھی۔ کنول جیسی ضرورتاً گھر سے نکل کر نوکری کرنے والی لڑکی کی پریشانی کا مسئلہ معاشی نوعیت کے ہونے کا امکان سب سے زیادہ تھا۔ معظم نے اپنے سامنے موجود ٹیبل کلینڈر پر نظر ڈالی۔ آج پچیس تاریخ تھی۔ معظم کی فیکٹری میں ورکرز کی تنخواہیں دو تاریخ کو دی جاتی تھیں۔ یعنی فیکٹری قوانین کے مطابق کنول کو تنخواہ ملنے میں ابھی پورا ایک ہفتہ باقی تھا۔ اگر معظم کے یقین کے مطابق کنول کی پریشانی معاشی نوعیت کی ہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ یہ پورا ہفتہ پریشانی میں گزارے گی۔ معظم کو کنول کی پریشانی گوارا نہیں تھی۔ اس نے انٹرکام پر کنول کو فیکٹری کے اکاؤنٹینٹ کو اپنے آفس میں بھیجنے کی ہدایت دی۔ اکاؤنٹینٹ کے حاضر ہوتے ہی اگلے لمحے وہ اسے کنول کی سیلری آج ہی ادا کرنے کی ہدایت دے رہا تھا۔

☆☆☆

اکاؤنٹینٹ سے سیلری کا لفافہ وصول کرتے ہوئے کنول دم بخود رہ گئی۔ حقیقت یہی تھی کہ اسے رقم کی شدید ضرورت تھی۔ امی نے دن رات محنت کر کے ایک بیگم صاحبہ کی طرف سے ملنے والا سلائی کا کام ہنگامی بنیادوں پر مکمل کیا تھا کہ سلائی کی رقم ہاتھ آ جائے تو کنول کی تنخواہ ملنے تک گھر کا خرچہ سہولت سے چل جائے لیکن ہوا یہ تھا کہ بیگم صاحبہ کا ڈرائیور سلے ہوئے کپڑے تو وصول کر کے لے گیا تھا پر انہوں نے ڈرائیور کے ہاتھ سلائی کی اجرت نہیں بھجوائی تھی۔ امی نے ڈرائیور سے بیگم صاحبہ کو کہلوایا تھا کہ وہ انہیں اجرت بھجوا دیں لیکن دو دن گزرنے کے بعد بھی ان کی طرف سے رقم نہیں آئی تھی۔ کنول کو معلوم تھا کہ اب یہ رقم اسی وقت آئے گی جب بیگم صاحبہ اپنے مزید کپڑے سلنے کے لیے دینے ان کے گھر آئیں گی۔ بات یہ نہیں تھی کہ وہ کوئی کنجوس عورت تھیں۔ کپڑوں کی سلائی کے عوض ان کی طرف سے ہمیشہ مناسب اجرت ہی ملا کرتی تھی لیکن انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ رقم جو ان کے نزدیک معمولی تھی، اس کی بروقت ادائیگی کنول کے خاندان کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے۔ امی وہ بھی ان کی اس کوتاہی پر کبھی شکوہ نہیں کیا کرتی تھیں کہ ان کا

عمومی خرچہ اردگرد کے گھروں کی سلائی کر کے نکل آتا تھا۔ بیگم صاحبہ کی طرف سے ملنے والی رقم کو وہ عموماً کسی ایسی مد میں خرچ کرتی تھیں جس کا تعلق روزمرہ کے اخراجات سے ہٹ کر بچوں کی فیسوں، کپڑوں وغیرہ سے ہوتا۔ مگر آج کل طبیعت کی خرابی کے باعث وہ زیادہ سلائی کا کام نہیں کر پا رہی تھیں اس لیے آس پاس کے گھروں کی سلائی کا کام موقوف کر کے بیگم صاحبہ کے کپڑے ترجیحی بنیاد پر یہ سوچ کر سی ڈالے تھے کہ سب سے اچھا کسٹمر ہاتھ سے نہ نکلنے پائے اور یکمشت مناسب رقم ہاتھ آ جائے لیکن بیگم صاحبہ نے ڈرائیور سے کہلوانے کے باوجود اپنے سابقہ بے پروا انداز کو برقرار رکھا تھا۔ شاید کنول کے گھر کا رکھ رکھاؤ انہیں اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ لوگ کسی قسم کی مالی دشواریوں کا شکار ہیں۔ پھر اتفاق سے امی نے انہیں یہ بھی بتا رکھا تھا کہ ان کا ایک بھائی دبئی میں ہے اور کبھی کبھار انہیں وہاں سے رقم بھیج دیتا ہے۔ یقیناً اس کبھی کبھار کو مستقل خیال کرتے ہوئے بیگم صاحبہ ان لوگوں کو اچھا خاصا آسودہ حال سمجھتی تھیں اس لیے بھی بے پروائی کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ اب اصل بات تو یہ تھی کہ قبر کا حال مردے کا سوا کون جان سکتا ہے۔ یہ تو کنول اور اس کے گھر والوں ہی کو معلوم تھا کہ پرچون کی دکان والے نے پچھلا حساب بے باق نہ ہونے کے سبب مزید سامان ادھار دینے سے صاف انکار کر دیا ہے، بجلی کا بل بھی دو ماہ سے ادا نہ کیے جانے کے سبب اس بار بجلی کٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ کنول کو فیکٹری کی طرف سے پک اینڈ ڈراپ کی سہولت ملی ہوئی تھی ورنہ شاید فیکٹری تک آنے جانے کا کرایا ادا کرنا بھی مشکل ہو جاتا۔

گھریلو حالات کے سدھار کے لیے اس کی فیکٹری کی جاب بہت ضروری تھی۔ کنول کو امید تھی کہ فیکٹری سے ملنے والا مناسب مشاہرہ جلد ان کو اس کرائسس سے نکال دے گا اور آج قبل از وقت ہاتھ آ جانے والی سیلری کو پا کر اسے جو سکون محسوس ہوا تھا اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ اس کی امید بے جا نہیں تھی۔ البتہ کنول کو تھوڑی سی حیرت تھی کہ اسے قبل از وقت تنخواہ کیونکر ادا کر دی گئی مگر پھر ذرا سی سوچ بچار نے اس پر صورتِ حال واضح کر دی۔ اسے خیال آیا کہ معظم نے جب اسے اپنے کمرے میں ڈکٹیشن کے لیے بلایا تھا تو اس سے اس کی طبیعت پوچھی تھی۔ یقیناً وہ کنول کے چہرے سے اس کی پریشانی بھانپ گیا تھا۔ اسی لیے اس نے اکاؤنٹینٹ کو اپنے آفس میں بلایا تھا کہ اسے کنول کو تنخواہ دینے کی ہدایت دے سکے۔ معظم کے اس عمل نے کنول کے دل میں اس کی عزت کو بڑھا دیا تھا۔ وہ یقیناً ایک اچھا چہرہ شناس تھا جو بہت زیادہ کریدنہ لگانے کے باوجود اس کی پریشانی کی نوعیت سمجھ گیا تھا اور مہذب طریقے سے پریشانی کا حل بھی پیش کر دیا تھا۔ اگر وہ کوئی بدقماش قسم کا موقع پرست آدمی ہوتا تو کنول کی ضرورت کے اس مقام تک آنے کا انتظار کرتا جب وہ خود اپنے منہ سے اپنی ضرورت بیان کرنے پر مجبور ہو جاتی اور پھر وہ اس پر احسان جتاتے ہوئے اس کی ضرورت اس انداز میں پوری کرتا کہ کنول خود کو زیرِ بار ہی محسوس کرتی رہتی۔ کم عمری کے باوجود کنول ان ہتھکنڈوں سے ناواقف نہیں تھی جو کنول جیسے حالات رکھنے والی لڑکیوں کو زیرِ دام لائے جانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ مگر معظم نے کنول میں دلچسپی رکھنے کے باوجود ایسا کوئی ہتھکنڈا استعمال نہیں کیا تھا۔ اس نے تو اشارتاً بھی کنول کو یہ جتانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ اس پر کوئی احسان کر رہا ہے اور اس کے اس انداز نے کنول کے دل میں معظم کی قدر کچھ اور بھی بڑھا دی تھی۔

☆☆☆

''طبیعت کیسی ہے تمہاری؟'' آج بہت دنوں بعد معظم رات کے کھانے پر اپنی بیوی کے ساتھ موجود تھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''ڈاکٹر انصاری سے ملاقات کی تھی تم نے؟'' معظم نے اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے ہوتے حلقوں کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ جواباً وہ خاموش رہی۔

''اس طرح اپنی صحت کے ساتھ بے پروائی برتنا کوئی اچھی بات نہیں۔ مجھ سے چھپا کر یا جھوٹ بول کر تم میرے ساتھ نہیں اپنے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔ کیا میں نہیں سمجھتا کہ اچانک تم نے الگ بیڈروم میں سونا کیوں شروع کر دیا ہے؟ تم تو شاید یہ سمجھتی ہو کہ میں نے تمہارے بہانے پر یقین کرتے ہوئے یہ بات مان لی ہے کہ میرے دیر تک جاگنے سے تم ڈسٹرب ہوتی ہو اس لیے الگ سونے لگی ہو حالانکہ میرا راتوں کو دیر تک جاگنا کوئی نئی بات نہیں پھر تم خود کو سابقہ جلدی سونے کی عادی ہو؟ میری طرح تمہیں بھی تو سلیپنگ پلز لیے بغیر نیند نہیں آتی۔'' معظم بہت فرصت سے اس کا محاسبہ کر رہا تھا۔

''جب آپ ساری بات سمجھتے ہیں تو پھر مجھ سے کیوں سوال کرتے ہیں؟ تھکتے نہیں ہیں آپ اس روز روز کی مشقت سے؟ ڈاکٹرز، ہاسپٹل، دوائیں۔ ساری زندگی میری وجہ سے آپ نے ان ہی چکروں میں گزاری ہے۔ بس اب جانے دیں اس چکر کو۔ چھوڑ دیں مجھے میرے حال پر۔ آخر کب تک

آپ ان مصنوعی سہاروں سے میرے نیم مردہ وجود میں زندگی کو ٹھہرائے رکھنے کی کوشش کرتے رہیں گے؟'' معظم جانتا تھا وہ خودترسی کا شکار ہے۔ زندگی کے دیے زخم اپنی جگہ لیکن ایک سچ یہ بھی تھا کہ اس نے کبھی حالات سے مفاہمت کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر وہ یہ کوشش کرتی تو ان دونوں کی زندگی موجودہ زندگی سے کہیں بہتر ہوسکتی تھی۔ بیٹی کا وجود بھی اسے اس مفاہمت پر مجبور نہیں کر سکا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس کی ذہنی حالت دقتاً فوقتاً اس درجے پر پہنچ جاتی تھی کہ معظم کے پاس اسے کسی نفسیاتی اسپتال میں داخل کروانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا تھا۔ بیٹی کو بھی اس نے اسی وجہ سے گھر سے دور مری کانونٹ میں داخل کروا رکھا تھا کہ گھریلو پریشانیاں اور ماں کی حالت اسے ڈسٹرب نہ کرے۔

''اس انداز میں سوچ کر تم خودغرضی کا مظاہرہ کرتی ہو اور کچھ نہ سہی لیکن تمہیں مومو کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ صرف چودہ سال کی ہے وہ۔ اسے تمہاری، اپنی ماں کی ضرورت ہے۔'' معظم کو اس پر غصہ آرہا تھا لیکن وہ تحمل کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے سمجھانے لگا۔

''مومو سے بھی کم عمر بچے ماں کے بغیر رہ لیتے ہیں یہ بات ہم دونوں اچھی طرح جانتے ہیں۔ پھر مومو کو تو یوں بھی میری عادت نہیں۔ چھوٹی تھی تو آیا کی گود میں رہی۔ ذرا بڑا ہونے کے بعد آپ نے اسے ہاسٹل بھیج دیا۔ کبھی کبھار صرف چھٹیوں میں ملنے والی ماں اگر نہ بھی رہی تو اسے کون سا بہت زیادہ فرق پڑ جائے گا۔'' اس کے پاس اپنی ہی دلیلیں تھیں جن سے وہ معظم کو ہمیشہ بے بس کر دیا کرتی تھی۔

''کیوں کرتی ہو تم ایسا؟ زندگی کا ایسا کون سا آرام اور سکھ ہے جو میں نے تمہیں دینے کی کوشش نہیں کی؟'' معظم جو کھانے سے پہلے ہی ہاتھ کھینچ چکا تھا نیپکن سے ہاتھ صاف کرتا ہوا لاچاری سے بولا۔

''میں نے کب ایسا کہا ہے؟ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجھے آپ سے کبھی کوئی شکوہ نہیں رہا۔ میں تو خود ہمیشہ اس احساسِ جرم میں مبتلا رہی ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو آپ کی زندگی کی خوشیاں نہیں مل سکیں۔ میں بنا خواہش آپ کی زندگی میں داخل ہوئی اور آپ اپنی شرافت کی وجہ سے آج تک اس ناپسندیدہ رشتے کو نبھا رہے ہیں۔ اگر آپ میرے کہنے پر کم از کم دوسری شادی کے لیے ہی راضی ہو جاتے تو میرے دل کا بوجھ کچھ کم ہو جاتا۔ مگر آپ نے ایسا نہ کر کے میرے احساسِ جرم کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔'' یہ وہ دیرینہ مطالبہ تھا جو بیس سالہ ساتھ میں وہ بارہا معظم سے کرتی رہی تھی۔ معظم جس کا دل ہی اس شادی کے بعد بجھ کر رہ گیا تھا ہر بار اس مطالبے کو سختی سے رد کر دیتا تھا لیکن آج وہ خاموش رہا۔ بیوی کی بات سن کر اس کا ذہن خود بخود کنول منیر کی طرف چلا گیا تھا۔ کنول کے لیے اس کے دل میں جو جذبہ جاگا تھا وہ اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ اپنی بیوی کی پیشکش سے فائدہ اٹھالے لیکن بہت کچھ تھا جو اسے اپنی اس خواہش پر عمل کرنے سے روک رہا تھا۔

☆☆☆

''ناجیہ! ذرا اپنی اور اپنے بھائیوں کی وہ چیزیں تو لے کر آجو تیری ماں کل خرید کر لائی تھی۔'' حسینہ گھر واپس پہنچی تو شمس علی کو اپنا لایا ہوا مفلر اور جرابیں سامنے رکھے بیٹھا پایا۔ حسینہ کی آمد پر اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے وہ ان ہی چیزوں پر نظریں گاڑھے بیٹھا رہا تھا۔ حسینہ اس کی اس کیفیت پر مسکرا دی۔ یقیناً بہت دنوں بعد نئی چیزیں وہ بھی اتنی عمدہ معیار کی دیکھ کر شمس علی خوش ہو گیا تھا اور اب بچوں کی طرح انہیں بار بار دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ ناجیہ نے اس کے حکم پر اپنی اور دونوں بھائیوں کی چیزیں لا کر مفلر اور جرابوں کے ساتھ ہی اس کے سامنے رکھ دیں۔ شمس علی ایک منٹ تک ان چیزوں کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے اپنی چارپائی کے نیچے ہاتھ ڈال کر وہاں سے ایک بوتل نکالی۔ اس بوتل میں وہ کچھ دیر قبل ہی دکان سے مٹی کا تیل لے کر آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ حسینہ اور بچے کچھ سمجھ پاتے شمس علی نے تمام اشیا نیچے فرش پر ڈھیر کیں اور ان پر مٹی کے تیل کی بوتل الٹ کر ایک جلتی ہوئی ماچس کی تیلی اس ڈھیر پر پھینک دی۔ اونی کپڑوں نے مٹی کے تیل کے ساتھ فوراً ہی آگ پکڑ لی۔

''ابا.....'' ناجیہ نے صدمے کی کیفیت میں اس جلتے ہوئے ڈھیر میں سے اپنی شال کھینچنے کی کوشش کی۔

''خبردار! جو کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔ جان سے مار دوں گا۔'' شمس علی بری طرح غرایا۔

ناجیہ نے خوفزدہ ہو کر ہاتھ پیچھے کر لیا۔ انور اور اکبر بھی سہمے ہوئے کھڑے رہے۔

''یہ کیا کیا تم نے شمس علی؟'' حسینہ جو بالکل گنگ ہو گئی تھی ہوش میں آکر چلائی۔

''کیوں بہت دکھ ہو رہا ہے؟'' شمس علی نے طنز سے حسینہ سے پوچھا۔

''نہیں ہوگا کیا؟ روپے کوئی پیڑوں پر تو نہیں اگتے۔ کتنی محنت کے بعد ان چیزوں کے لیے میں نے روپے

جوڑے تھے۔'' صدمے سے حسینہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''محنت سے روپے جوڑے تھے یا چھوٹے شاہ کی مہربانی کا کمال تھا یہ سارا؟'' شمس علی نے راکھ میں تبدیل ہوئی اشیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زہر خند لہجے میں پوچھا۔

''کس نے کہا تم سے کہ یہ چھوٹے شاہ صاحب کی مہربانی ہے؟'' حسینہ چونکی۔

''تو کیا نہیں ہے؟ مجھ سے مکر کرنے کی کوشش مت کرنا۔ افضل نے خود تجھے اس کے ساتھ بازار میں دیکھا تھا۔'' شمس علی پھٹ پڑا۔

''اچھا تو یہ ساری اس افضل کی لگائی ہوئی آگ ہے۔ مردود کے اپنے کرتوت شیطانی ہیں اور دوسروں کی جاسوسیاں کرتا پھرتا ہے۔ اگر میں تمہیں تمہارے اس جگری دوست کی حرکتیں بتادوں تو تم اس کی شکل دیکھنا گوارا نہ کرو۔'' افضل کا نام سن کر حسینہ بھی بپھر گئی تھی۔

''افضل کی بات چھوڑ اور یہ بتا کہ تجھے یہ چیزیں چھوٹے شاہ نے دلائی تھیں یا نہیں؟''

شمس علی کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

''اگر دلا بھی دیں تو کیا برا کیا؟ یہ تو ان کی مہربانی ہے کہ غریب بچوں کا اتنا خیال کرتے ہیں ورنہ یہاں جس کے پاس ذرا چار پیسے ہوں تو ہم جیسوں سے بات بھی کرنا پسند نہیں کرتا۔'' حسینہ کے اس جملے میں ڈھکا چھپا اعتراف تھا۔

''مجھے اور میرے بچوں کو چھوٹے شاہ کی ان مہربانیوں کی ضرورت نہیں۔ تیرا دل ان چیزوں کے لیے تڑپتا ہے تو شوق سے وصول کرتی پھرا کر اس کی یہ مہربانیاں۔ بھلا مجھ سا معذور آدمی تجھے تیری مرضی کرنے سے کیسے روک سکتا ہے؟'' شمس علی کا لہجہ پست ہو کر آزردہ سا ہو گیا تو حسینہ کو افسوس ہونے لگا۔ وہ شمس علی کی کیفیت سمجھ سکتی تھی۔ وہ خاندان کا سربراہ ہونے کے باوجود خاندان کی کفالت کا فریضہ انجام نہیں دے پا رہا تھا اس لیے جھنجلاہٹ اور چڑچڑے پن کا شکار ہو گیا تھا۔

درحقیقت شمس علی کے دل میں کیا خیال پلنے لگا تھا اس کا تو حسینہ اندازہ ہی نہیں لگا سکی تھی۔

☆☆☆

اپنے کیبن میں بیٹھی کنول خود پر جمی معظم کی نظروں کی تپش محسوس کر رہی تھی۔ ابتدا میں وہ اپنے اس طرح دیکھے جانے پر کچھ نروس ہو جاتی تھی لیکن اب اسے یہ بات اچھی لگنے لگی تھی۔ دن میں کسی بھی وقت اچانک معظم اس کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا اور کمال یہ تھا کہ وہ اس کا متوجہ ہونا محسوس بھی کر لیتی تھی۔ ان لمحات میں اس کی کوشش ہوتی کہ چہرے سے کسی بھی قسم کے تاثرات کو ظاہر کیے بغیر کام میں منہمک نظر آئے لیکن آج اچانک ہی اسے شرارت سوجھ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ کسی طرح معظم کو جتادے کہ وہ اس کی اس چوری سے واقف ہے۔ ذرا سا سوچنے پر اسے ایک خیال بھی سوجھ گیا۔ بالکل غیر محسوس طور پر اس نے اپنی کرسی کا رخ موڑ کر اس زاویے پر کر لیا کہ معظم کی طرف سے تھوڑی سی آڑ ہو جائے اور وہ اس کے ہاتھوں کی جنبش نہ دیکھ سکے۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے اپنی ٹیبل کی دراز سے پیپر کٹر نکالا اور آنکھیں میچتے ہوئے اپنے بائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی پر اس سے ایک کٹ لگا دیا۔ فوراً ہی انگلی سے خون بہ نکلا۔ کنول ایک جھٹکے سے کرسی واپس موڑتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔ اس کی انگلی سے نکلنے والے خون کے قطرے سامنے رکھے لیٹر پیڈ پر گرنے لگے۔ اسے یقین تھا کہ اس کی انگلی سے بہتا یہ خون معظم کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا ہوگا۔ اگلے ہی لمحے اس کے یقین پر تصدیق کی مہر لگ گئی۔ معظم بہت تیزی سے گھبرایا ہوا اس کے کیبن میں داخل ہوا۔

''کیا ہوا کنول! ہاتھ کیسے کٹ گیا؟'' بہت بے ساختگی سے اپنی جیب سے رومال نکال کر کنول کی انگلی سے بہنے والے خون کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے اس بات کا بھی دھیان نہیں تھا کہ اسٹاف کے لوگ اس کی یہ حرکت دیکھ رہے ہوں گے۔

''سر! ذرا سی بے دھیانی سے پیپر کٹر سے زخم لگ گیا۔ آپ فکر نہ کریں میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' کنول نے ہونٹ دبا کر مسکراہٹ چھپاتے ہوئے معظم کی بات کا جواب دیا اور بالکل غیر محسوس طور پر اس کا ہاتھ بڑھا کر خود رومال سے اپنا خون روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ ویسے معظم کو آزمانے کے چکر میں کی جانے والی شرارت خود اسے بھی مہنگی پڑی تھی۔ زخم اندازے سے کچھ زیادہ ہی گہرا لگ گیا تھا اور جریان خون کے ساتھ ساتھ تکلیف بھی محسوس ہو رہی تھی۔

''افتخار صاحب! ڈاکٹر نصیر کو فرسٹ ایڈ بکس کے ساتھ میرے آفس میں بھیجیں۔''

کنول کے ہاتھ چھڑا لینے پر معظم انٹرکام کی طرف متوجہ ہوا اور کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں ہر وقت فیکٹری میں موجود رہنے والے ڈاکٹر کو بھیجنے کی ہدایت دی۔ اس طرف سے فارغ ہو کر وہ کنول کی طرف متوجہ ہوا۔ ''آپ

میرے آفس میں چلیے۔'' کنول نے فرمانبرداری سے اس کے حکم کی تعمیل کی اور معظم کے ساتھ اس کے آفس میں چلی گئی۔ ڈاکٹر بھی فوراً حاضر ہوگیا اور کنول کی انگلی سے بہنے والے خون کو روک کر اس پر پٹی باندھ دی۔

''دھیان کہاں تھا آپ کا جو خود کو اتنی گہری چوٹ لگا بیٹھیں۔'' ڈاکٹر کے جانے کے بعد معظم نے قدرے تیز لہجے میں کنول سے پوچھا۔ کنول کی مدت ملازمت میں یہ پہلا موقع تھا جو معظم اس سے اس لہجے میں بات کررہا تھا۔

''سوری سر! اصل میں، میں کچھ نروس ہوگئی تھی۔'' کنول نے نظریں جھکا کر معذرت خواہانہ انداز میں کہا تو معظم حیران سا ہوگیا۔

''نروس ہوگئی تھیں..... مگر کس چیز سے؟'' اس کی حیرت سوال بن کر لبوں پر چلی آئی۔

''آپ کو کیسے معلوم ہوا سر کہ میری انگلی کٹ گئی ہے؟'' کنول نے اس کے سوال کا جواب دیے بغیر نظریں جھکائے جھکائے ہی اس سے پوچھا۔

''وہ تو میں.....'' معظم اس کے سوال کا جواب دینے جارہا تھا کہ اچانک چپ ہوگیا۔ وہ کنول کی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا۔ اس نے کہا تھا وہ نروس ہوگئی تھی اور معظم کے پوچھنے پر کہ کس چیز سے نروس ہوگئی تھی؟ بتانے کے بجائے اس سے پوچھ رہی تھی کہ معظم کو اس کی انگلی کٹنے کا کیسے پتا چلا؟ یقیناً وہ جتا رہی تھی کہ وہ معظم کی تاک جھانک سے گھبرا کر اپنی انگلی زخمی کر بیٹھی ہے۔

''سوری۔'' چوری پکڑے جانے کا احساس ہونے پر معظم نے فوراً ہی معذرت طلب کرلی۔

''آپ کو سوری کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ مجھے کچھ برا ہی نہیں لگا۔'' کنول کا جواب میں کہا گیا جملہ ایک بار پھر معظم کو چونکا گیا۔ اس نے گہری نظروں سے اپنا سر جھکائے سامنے بیٹھی کنول کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی لیکن پلکیں حیا کے بوجھ سے لرز رہی تھیں یعنی وہ واقف تھی کہ کیا کہہ رہی ہے۔

''تھینک یو ویری مچ کنول۔'' معظم یکدم ہی ہلکا پھلکا ہوگیا۔ بہت دنوں سے وہ جس کشمکش کا شکار تھا کنول کے ردعمل نے اسے ختم کردیا تھا۔ البتہ جگہ ہنسائی اور رسوائی کا خوف ابھی پوری طرح دل سے نہیں نکلا تھا۔

☆☆☆

بات کھل جانے کے بعد معظم اور کنول نے ایک خودکار سے انداز میں اپنے تعلق کو قبول کرلیا تھا۔ معظم کو کنول کے رویے پر حیرت ہوتی تھی۔ باوجود کم عمر ہونے کے وہ بہت پختہ سوچ کی حامل تھی۔ اس میں ٹھہراؤ تھا معظم نے اس عمر کی لڑکیوں کو عموماً لاابالی ہی پایا تھا ایسے میں کنول کا انداز اس کے لیے حیران کن تھا۔ معظم کی چوری پکڑ لینے کے بعد اس نے دوبارہ معظم سے اس موضوع پر بات نہیں کی تھی۔ اس کے انداز میں معظم کے لیے اپنائیت بے شک بڑھ گئی تھی لیکن وہ اس انداز میں معظم سے بے تکلف نہیں ہوئی تھی کہ اس کے احترام میں کمی آتی۔ وہ معظم کی بہت عزت کرتی تھی۔ اس کی خیالداری میں بھی ایک گھریلو عورت کا سا انداز تھا۔ وہ ادائیں اور طرّاری جو اس طرح کی پوسٹ پر کام کرنے والی لڑکیوں کا خاصہ سمجھی جاتی ہیں، کنول میں ان کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ وہ کم عمر اور ناتجربہ کار ہونے کے باوجود باوقار تھی۔ معظم سے بات کرتی تو باحیا بے شک محسوس ہوتی لیکن کم اعتماد ہرگز نہیں۔ ابتدا میں اس کے اس انداز پر حیران ہونے والے معظم کو آہستہ آہستہ کنول کی اس چنچلتی کی وجوہات سمجھ آنے لگیں۔

کنول ایک غریب مگر باعزت گھرانے کی فرد تھی۔ والد کے انتقال کے بعد اس نے زندگی کے بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے تھے۔ خصوصاً ان ماموؤں کے بدلتے انداز نے جن کی پرورش ہی اس کی ماں کے ہاتھوں ہوئی تھی، کنول کو زندگی کو پڑھنے کا بہت موقع دیا تھا۔ وہ گھر کی بڑی بیٹی تھی اس نے ماں کی ساری پریشانیوں اور دکھوں کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا اور پھر مناسب وقت آتے ہی اپنی ذمے داری سمجھتے ہوئے ماں کی سہولت کے لیے گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ قسمت سے اسے معظم کے پاس ملازمت مل گئی۔ مہذب، پُرکشش اور باوقار دکھائی دینے والے معظم کا اپنی طرف جھکاؤ دیکھ کر وہ متاثر تو ہوئی لیکن اپنے وقار کو نہ کھونے دیا۔ تعلق کی نوعیت بدل گئی پر احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ وہ اور معظم دفتری نوعیت کے معاملات کے علاوہ بھی نوعیت کے مسائل اور باتیں بھی ایک دوسرے سے شیئر کرنے لگے لیکن ایسی بے تکلفی دونوں میں سے کسی کے انداز میں بھی جھلکنے نہ پائی کہ دیگر لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع مل پاتا۔ ان دونوں کی گفتگو ہوتی بھی بہت سادہ تھی۔ کنول کے پاس اپنے گھر والوں کے مسائل حل کرکے انہیں خوشیاں دینے کے چھوٹے چھوٹے خواب تھے تو معظم کے پاس اپنی اکلوتی بیٹی کے قصے۔ اسے پہلی بار دیکھنے سے لے کر اس کے بولنے، قدم اٹھانے، اسکول جانے تک کا ہر قصہ وہ بہت شوق سے کنول کو سناتا۔ بیوی کے بارے میں اس نے کنول کو صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ

اکثر بیمار رہتی ہے۔ بیوی کی بیماری اور اپنی مصروفیات کی وجہ سے ہی اس نے مومو کو مری کانونٹ میں داخل کروادیا تھا۔ وہ بیٹی کے دور رہنے سے خوش نہیں تھا لیکن اس کے بہتر مستقبل کے لیے یہی مناسب سمجھتا تھا کہ وہ مری میں رہ کر ہی اپنی تعلیم مکمل کرے۔ وہ مومو سے فون پر ہونے والی گفتگو کے بارے میں بھی اکثر کنول کو آگاہ کرتا رہتا تھا۔ کنول بہت اشتیاق سے اس کی ساری باتیں سنتی تھی۔ مومو، معظم کو عزیز تھی اور خود معظم، کنول کو۔ ایسے میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ مومو سے محبت نہ کرتی۔

چاہت کا تو پہلا اصول ہی یہ ہوتا ہے کہ جسے چاہا جائے اس کی عزیز چیزوں کو اس سے بڑھ کر عزیز رکھا جائے۔ کنول منیر اس اصول سے خوب واقف تھی۔ کیسے واقف نہ ہوتی؟ محبت اپنے اصول وقواعد خود آدمی کو سکھاتی ہے۔ جس دل پر محبت آسمانی تحفے کے مانند اترتی ہے اس دل میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے اور اس وسعت میں محبوب کے سارے پیارے آسانی سے سٹ آتے ہیں۔ کنول بھی اس تجربے سے گزر رہی تھی۔ اسے معظم ہی نہیں اس سے وابستہ ہر شے، ہر رشتہ پیارا تھا۔ وہ ان لوگوں پر حیران ہوتی تھی جو محبت میں شیئر کے قائل نہیں ہوتے۔ خود اسے تو محبت نے بانٹنا ہی سکھایا تھا۔ وہ ہر اس شخص سے محبت کرنے کو تیار تھی جس کا معظم کی محبت میں حصہ تھا۔ اسے کسی اور کے معظم کی محبت میں حصہ دار ہونے پر کوئی اعتراض نہ تھا وہ تو خود اپنے حصے پر قانع اور شاکر تھی۔ جو کچھ اسے ملا تھا اور مل رہا تھا وہ نہ ملتا تو وہ اس پر اپنے حق کا دعویٰ تو نہیں کرسکتی تھی۔ یہ طرز فکر ایسا تھا جس نے اسے شکرگزاری کی طرف مائل کردیا تھا۔ شکرگزار ہونا خود اپنی جگہ کتنی بڑی نعمت ہے یہ تو اس نعمت سے مالا مال بندہ ہی سمجھ سکتا ہے۔

☆☆☆

''تیرا بخار تو ابھی تک کم نہیں ہوا۔'' شمس علی نے چارپائی پر لیٹی حسینہ کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور بخار کی حدت محسوس کرتے ہوئے تشویش سے بولا۔ اس دن کے واقعے کے بعد دونوں میں کھچاؤ سا آگیا تھا لیکن دو دن سے شدید بخار میں مبتلا حسینہ کی تکلیف نے شمس علی کا دل اس کے لیے پھر سے موم کردیا تھا۔

''میں انور کے ساتھ تیار لفافے دینے بازار تک جارہا ہوں۔ واپسی میں ڈاکٹر کو بھی دیکھتا آؤں گا۔ ذرا پوچھوں تو اس سے کہ دوا کھانے کے باوجود بخار اتر کیوں نہیں رہا۔''

حسینہ نے شمس علی کی پہلی بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا اس بار بھی بس ذرا سا سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ بخار کے باعث نقاہت اتنی ہوگئی تھی کہ کچھ بولنے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

''دروازہ بند کرلے ناجیہ! میں اور انور جارہے ہیں۔'' شمس علی نے بائیں ہاتھ میں لفافوں کا بنڈل اٹھاتے ہوئے ناجیہ کو آواز دی۔ اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار انور نے بھی دونوں ہاتھوں سے تیار شدہ لفافوں کا ایک بنڈل تھام رکھا تھا۔ ناجیہ جو باورچی خانے میں مصروف تھی شمس علی کی آواز پر باہر نکلی۔ ''ابا! ذرا اظہر کو بھی دیکھ لینا۔ میدان میں کھیلنے کے لیے گیا تھا اب تک واپس نہیں آیا۔''

شمس علی اور انور کے پیچھے دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے شمس علی کو ایک اور کام بتایا اور پھر کمرے میں حسینہ کے پاس آگئی۔

''تمہارے لیے دلیا پکادوں اماں؟ تم نے دو دن سے ڈھنگ سے کچھ بھی نہیں کھایا۔'' حسینہ کے قریب چارپائی پر بیٹھ کر اس کے پاؤں دباتے ہوئے ناجیہ نے اس سے پوچھا۔

''رہنے دے کچھ بھی کھانے کو دل نہیں کررہا۔'' حسینہ نے کراہتے ہوئے انکار کیا۔

''پر کچھ تو کھانا ضروری ہے۔ خالی پیٹ دوا کیسے کھاؤ گی؟'' ناجیہ نے اصرار کیا۔

''چائے بسکٹ کھالوں گی۔ تجھے جان مارنے کی ضرورت نہیں۔'' حسینہ نے اس کی بات کا جواب دے کر آنکھیں موندلیں۔ ناجیہ بیٹھی اس کے پیر دباتی رہی۔ حسینہ کو اس کی یہ خدمت گزاری بہت بھاتی تھی۔ وہ اس کی سگی بیٹی نہیں تھی لیکن خدمت بالکل ویسے ہی کرتی تھی۔ حسینہ کے اپنے دل میں ناجیہ کے لیے بڑا پیار تھا۔ وہ اس کے لیے بہت اونچے خواب دیکھتی تھی۔ وہ تو غریبی حالات کی وجہ سے ناجیہ مڈل سے آگے پڑھ نہیں سکی، پھر اس کا اپنا دل بھی پڑھائی میں نہیں لگتا تھا ورنہ حسینہ کی تو خواہش تھی وہ پڑھ لکھ جائے تاکہ اس کی کسی اچھی جگہ شادی ہوسکے۔ اب بھی وہ اس خواہش سے دستبردار نہیں ہوئی تھی اور اسے امید تھی کہ جلد اس کی یہ خواہش پوری ہوجائے گی۔ ناجیہ اپنے لیے حسینہ کے ان جذبات سے واقف تھی اسی لیے تو سگی ماں سے بڑھ کر اس کا احترام کرتی تھی۔ سوتیلی ماؤں کے جتنے قصے اس نے سن رکھے تھے حسینہ میں ان کی ہلکی سی جھلک بھی نہیں ملتی تھی۔ انور، اظہر پر تو وہ شاید کبھی سختی کر بھی جاتی ہو لیکن ناجیہ پر ہمیشہ مہربان رہتی تھی۔

''بس چھوڑ دے میرے پاؤں۔ پہلے جاکر کھانا

پکالے۔ تیرے ابا اور بھائی واپس آ کر کھانا مانگیں گے۔''
حسینہ نے کروٹ لیتے ہوئے مسلسل پیر دباتی ناجیہ سے کہا تو وہ اٹھ کر واپس باورچی خانے میں چلی گئی۔ چولہے پر چڑھی مونگ کی دال اس دوران گل چکی تھی۔ ناجیہ بگھار کے لیے پیاز کاٹنے لگی۔ آٹا وہ پہلے ہی گوندھ کر رکھ چکی تھی کہ ٹھہر کر روٹیاں ڈال لے گی۔ دال بگھار کر فارغ ہونے کے بعد اس نے چولہے پر توا چڑھایا اور آٹے کا پیڑا بنانے لگی۔ ابھی پہلا ہی پیڑا بنا تھا کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔ شمس علی اور انور، اظہر کے واپس آنے کا قیاس کرتے ہوئے اس نے تیزی سے جا کر دروازہ کھولا پر سامنے موجود شخص کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ تو چھوٹے شاہ صاحب تھے۔

''السلام علیکم۔'' بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے انہیں سلام کیا اور اپنا بے پروائی سے اوڑھا گیا دوپٹا درست کرنے لگی۔

''وعلیکم السلام۔ کیا اندر نہیں بلاؤ گی؟'' چھوٹے شاہ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

''آجائیں۔ اماں اندر کمرے میں لیٹی ہیں۔ میں انہیں آپ کے آنے کا بتاتی ہوں۔'' ناجیہ تیزی سے اندرونی کمرے کی طرف بھاگی۔ چھوٹے شاہ نے بھی اس کی پیروی میں اس کمرے کا رخ کیا۔

''میں سمجھ گیا تھا کہ کوئی مسئلہ ہے ورنہ حسینہ بی اور دو دن کی اکٹھی چھٹی کرلے ممکن ہی نہیں۔ خیریت معلوم کرنے کے خیال سے ہی میں یہاں آیا تھا۔'' حسینہ کے چہرے سے ہی اس کی طبیعت کی خرابی کا اندازہ لگاتے ہوئے وہ بولتا ہوا وہاں رکھی پلاسٹک کی اکلوتی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''بڑی مہربانی چھوٹے شاہ صاحب۔'' حسینہ بہ مشکل اٹھ کر بیٹھی اور پھر ناجیہ سے بولی۔ ''جا، جا کر شاہ صاحب کے لیے اچھی سی چائے تو بنالا۔'' ناجیہ فوراً ہی تعمیل حکم میں کمرے سے باہر نکل گئی۔

''کسی ڈاکٹر کو دکھایا؟'' چھوٹے شاہ نے تشویش سے حسینہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی یہیں محلے کے ڈاکٹر کو دکھایا تھا پر دوا کھانے کے باوجود آرام نہیں آرہا۔'' حسینہ نے جواب دیا۔

''یہ تو اچھی بات نہیں۔ ایسا کرو میرے ساتھ چلو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا لیتے ہیں۔'' چھوٹے شاہ نے پیشکش کی۔

''نہیں۔ پہلے ہی شمس علی ناراض ہے۔ اسے آپ کی ہم پر مہربانیاں اچھی نہیں لگتیں۔''

حسینہ نے انکار کیا تو وہ چپ ہوگیا۔

''آپ بیٹھیں میں ذرا منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر کلی کرآؤں۔ کب سے ایسے ہی پڑی ہوں۔'' خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد حسینہ نے چھوٹے شاہ سے کہا اور پیر لٹکا کر چارپائی سے اتر کر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ شدید نقاہت نے اس کی اس کوشش کو ناکام کردیا اور اسے بری طرح چکر آگیا۔ اس سے پہلے کہ وہ چکرا کر زمین پر گر جاتی چھوٹے شاہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور پھر احتیاط سے دوبارہ چارپائی پر لٹانے لگا۔ عین اسی وقت شمس علی نے دونوں بیٹوں کے ساتھ گھر میں قدم رکھا۔ ناجیہ گھبراہٹ میں بیرونی دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی اس لیے وہ لوگ سیدھے اندر چلے آئے۔ کمرے کا منظر پہلے ہی سے شک میں مبتلا شمس علی کے لیے ایک تازیانہ تھا۔ اس کی بیوی، اس کے گھر میں ایک غیر آدمی کی بانہوں میں تھی وہ کیونکر اس بات کو برداشت کرپاتا۔ غیرت جوش میں آئی اور اس نے آگے بڑھ کر اپنے اکلوتے ہاتھ سے چھوٹے شاہ کا گریبان پکڑ کر اسے زور سے جھٹکا دیا۔ چھوٹے شاہ کا سارا دھیان حسینہ کی طرف تھا۔ اس اچانک لگنے والے جھٹکے سے وہ بری طرح لڑکھڑا کر پیچھے کی جانب گرا۔

''بہت ہوگئی یہ بے غیرتی۔ بہت برداشت کرلیا میں نے۔ اب تو ایک دن بھی اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔'' اب شمس علی کی مخاطب حسینہ تھی۔ اسے کچھ بھی سمجھنے کی مہلت دیے بغیر اس نے چھوٹے شاہ کے انداز میں ہی جھٹکا دے کر چارپائی سے دھکیلا اور غصے سے دھاڑا۔ ''نکل جا اپنے یار کے ساتھ میرے گھر سے۔ میں نے تجھے طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی۔''

ناجیہ کی بلند چیخ، حسینہ کی پھٹی ہوئی آنکھیں اور چھوٹے شاہ کا حیران پریشان چہرہ کچھ بھی شمس علی کے لفظوں کے آگے بند نہ باندھ سکا اور آناً فاناً سب کچھ ختم ہوگیا۔

☆☆☆

''السلام علیکم پاپا!'' ائرپورٹ پر معظم پر نظر پڑتے ہی اس کی کھلی بانہوں میں سما جانے والا تیرہ چودہ سالہ لڑکی یقیناً مریم عرف مومو ہی تھی۔ سلام جواب کے مرحلے سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ معظم کے شانے سے لگی کسی چھوٹی بچی کی طرح اسے بتا رہی تھی کہ اس نے معظم کو کتنا مس کیا۔ معظم چہرے پر محبت بھری مسکراہٹ لیے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ کنول دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے باپ بیٹی کے درمیان مخل ہونے کی بالکل کوشش نہیں کی تھی۔ بالآخر معظم کو ہی خیال آیا اور وہ کنول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیٹی

سے بولا۔
''ان سے ملو مومو! یہ کنول منیر ہیں میری نئی سیکریٹری۔''
''ہیلو۔ نائس ٹو میٹ یو۔'' مومو نے مسکرا کر کنول سے ہاتھ ملایا۔
''مجھے بھی تم سے مل کر بہت اچھا لگا۔'' کنول نے مومو کے چہرے پر ایک پیار بھری تھپکی دی۔
وہ سچ مچ مومو سے مل کر بہت خوشی محسوس کر رہی تھی۔ جینز اور ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ میں ملبوس گوری رنگت اور دراز قد رکھنے والی مومو کی آنکھیں بالکل معظم جیسی تھیں۔ اس کی آنکھوں کا تاثر بھی معظم جیسا نرم اور کچھ کھویا کھویا سا تھا۔
''چلو گھر چلتے ہیں۔ باقی باتیں گھر جا کر ہوں گی۔ تمہاری مما انتظار کر رہی ہوں گی۔''
معظم نے مومو کا بیگ خود اٹھاتے ہوئے اس سے کہا تو وہ کنول کے ساتھ چپ چاپ معظم کے پیچھے پارکنگ کی طرف بڑھ گئی۔ واپسی کے سفر میں زیادہ تر مومو ہی باتیں کرتی رہی۔ معظم اس کی باتوں کے مختصر جواب دیتے یا مسکرانے پر اکتفا کرتا رہا۔ اس کے اس انداز سے بے نیاز مومو نے بے تکان گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔
''آپ میری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہیں مس کنول؟ ایکچوئلی بات یہ ہے کہ پاپا کہتے ہیں کہ انہیں مجھ سے باتیں کرنے سے زیادہ میری باتیں سننا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ میں پاپا کو خوش کرنے کے لیے اتنی ساری باتیں کرتی ہوں ورنہ اتنی زیادہ باتونی ہوں نہیں۔'' بولتے بولتے اسے دھیان آیا تو کنول سے سوال کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے رویے کی بھی وضاحت کرنے لگی۔ کنول نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ ویسے معظم کے چہرے پر موجود تاثرات مریم کے بیان کی تصدیق کر رہے تھے۔ معظم کو اتنا خوش اور مسرور اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آدھے گھنٹے کا سفر طے کر کے وہ لوگ معظم کے گھر پہنچے۔ کنول کا خیال تھا کہ معظم اسے آفس پر ڈراپ کر دے گا لیکن وہ تو اسے گھر تک لے آیا تھا۔ پہلی بار اسے کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ معظم کی بیٹی سے ملنا اور بات تھی، معظم کی بیوی کا سامنا کرنا اور بات۔ وہ عورت بیس سال سے معظم کی زندگی میں شامل تھی۔ یقیناً معظم پر صرف اپنے حق کی دعوے دار بھی ہوگی۔ اگر جو اسے معلوم ہو جاتا کہ یہ انیس سالہ لڑکی اس کے شوہر کی محبت میں حصہ دار بن بیٹھی ہے تو اس کا ردعمل کیا ہوتا؟ اپنی بیس سالہ رفاقت کا غرور ایک انیس سالہ لڑکی کے ہاتھوں ٹوٹنے کا صدمہ کسی عورت کے لیے معمولی تو نہیں ہو سکتا تھا۔ معظم کی محبت دل میں بسا کر اس کے سب رشتوں کے لیے بھی اپنے دل میں کشادگی پیدا کر لینے والی کنول نے معاملے کو کبھی اس رخ سے تو دیکھا ہی نہیں تھا۔ پہلی بار اسے خیال آ رہا تھا کہ اسے معظم کی بیوی کے وجود پر اعتراض نہیں بلکہ وہ تو ایک طرح سے اس سے بھی محبت کرتی ہے یہ سب باتیں اپنی جگہ لیکن ضروری تو نہیں کہ معظم کی بیوی بھی اس کے لیے اپنے دل میں گنجائش پیدا کر سکے۔
''رک کیوں گئیں؟ اندر چلو۔'' معظم نے اس کا ٹھٹک کر وہیں رک جانا محسوس کیا تو اسے ٹوکا۔ کنول نے ناچار قدم اندر کی طرف بڑھائے۔ اب یہاں تک آ کر واپس پلٹ جانا بھی تو ممکن نہیں تھا وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے اندر داخل ہوئی۔ دل شدت سے خواہشمند تھا کہ اس گھر کے چپے چپے کو اپنی نظروں سے چومے کہ یہ معظم کا گھر تھا لیکن اپنے حقدار نہ ہونے کا احساس اس خواہش کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔
''آیئے نا مس کنول۔'' مومو جو پہلے ہی اندر جا چکی تھی کنول کو دیکھ کر اس سے بولی اور پھر مڑ کر اپنی ماں سے مخاطب ہوئی۔
''آپ مس کنول کو جانتی ہیں مما؟ یہ پاپا کی نئی سیکریٹری ہیں۔'' سوال کرتے ہوئے اس نے تعارف بھی خود ہی کروا دیا تھا۔ کنول نے سر اٹھا کر مومو کے ساتھ کھڑی عورت کو دیکھنا چاہا۔ عورت پر پہلی نظر پڑتے ہی وہ بری طرح چونکی۔ وہ عورت معظم کی بیوی ہے اسے قطعی یقین نہیں آیا۔ دھنسی ہوئی آنکھیں، لاغر جسم، سیاہی مائل رنگت اور سب سے بڑھ کر بہت واضح طور پر محسوس ہونے والا عمر کا فرق۔ اسے لگا کہ اس عورت کو معظم کی بیوی کی حیثیت سے متعارف کروا کر اس کے ساتھ مذاق کیا جا رہا تھا۔ لیکن ایسا بے ہودہ مذاق کم از کم کوئی بیٹی تو نہیں کر سکتی تھی تو پھر اس کا مطلب تھا تقدیر نے معظم کے ساتھ مذاق کیا تھا۔ وہ عورت کہیں سے بھی تو اس کی بیوی نظر نہیں آتی تھی۔
''تشریف رکھیں کنول۔'' کنول کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے بہت نرمی سے اسے بیٹھنے کو کہا تو کنول سٹپٹاتی ہوئی ایک قریبی صوفے پر ٹک گئی۔ وہ شکر کر رہی تھی کہ معظم تعارف کے اس مرحلے کے دوران موجود نہیں تھا۔ وہ یہاں رکے بغیر اندرونی حصے کی طرف چلا گیا تھا۔ شاید اسے کنول کے ردعمل کا اندازہ تھا۔

☆☆☆

''آج تم ہمارے ساتھ ڈنر پر چلنا کنول! آج مومو کا برتھ ڈے ہے۔ اصل میں، میں نے اسے اسپیشلی بلوایا ہی اس وجہ سے ہے ورنہ ابھی تو اس کا سیشن چل رہا ہے۔ پرسوں وہ واپس بھی چلی جائے گی۔ میں چاہتا ہوں اس کے جانے سے پہلے تمہاری اس سے کم از کم ایک ملاقات اور ہو جائے۔'' دوسرے دن آفس میں معظم نے کنول سے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''کیا ہوا؟ کوئی مسئلہ ہے؟ اگر ڈنر پر چلنا تمہارے لیے مشکل ہے تو لنچ کا پروگرام رکھ لیتے ہیں۔'' معظم نے اسے سوچ میں پڑتے دیکھ کر کہا۔

''یہ مسئلہ نہیں ہے سر! بلکہ میرے خیال میں ڈنر ہی زیادہ بہتر رہے گا۔'' کنول نے فوراً ہی معظم کے خیال کی تردید کرتے ہوئے پہلے پروگرام کی حمایت کی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ڈنر پر جانے کی صورت میں اسے درمیان میں مومو کے لیے تحفہ خریدنے کا موقع مل جائے گا پھر اس کا پہنا ہوا لباس بھی کسی اچھے ریسٹورنٹ میں جانے کے لیے اتنا مناسب نہیں تھا اس حساب سے بھی اسے ڈنر کی دعوت ہی مناسب محسوس ہو رہی تھی مگر سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ اس فیملی ڈنر میں شرکت کے حوالے سے تذبذب کا شکار تھی کہ جانے اس کی شمولیت کو کس انداز میں لیا جاتا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تمہیں بھی ڈنر زیادہ سوٹ کر رہا ہے۔ پک اینڈ ڈراپ کا مسئلہ نہیں ہم لوگ خود تمہیں تمہارے گھر سے لے لیں گے۔'' اس کی رضامندی پا کر معظم آگے کا پروگرام طے کرنے لگا۔

''اگر میں اس ڈنر میں شرکت نہ کروں تو.....؟'' کنول نے معظم کے پُرجوش انداز سے نظر چرا کر کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''وجہ.....؟'' معظم نے غور سے اسے دیکھا۔

''کچھ عجیب سا لگتا ہے پتا نہیں آپ کی مسز کیا سوچیں گی اور شاید مومو کو بھی اچھا نہ لگے ایک آؤٹ سائڈر کا اپنے فیملی ڈنر میں شریک ہونا۔'' کنول نے اپنی الجھن بیان کی۔

''اگر صرف یہی دو مسئلے ہیں تو یقین کرو میری مسز نے خود تمہیں انوائٹ کرنے کو کہا ہے۔ رہی مومو، تو اسے تو خود تم بہت اچھی لگی ہو۔ وہ تمہیں دیکھ کر خوش ہو گی۔'' معظم نے جیسے چٹکی بجاتے میں کنول کا مسئلہ حل کر دیا تھا لیکن اس کے چہرے سے تذبذب اب بھی غائب نہیں ہوا تھا۔

''اور بھی کوئی مسئلہ ہے؟'' معظم نے اس کے تاثرات سے اندازہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں مسئلہ تو نہیں ہے بس مجھے آپ کی مسز کا سامنا کرتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ان کی مجرم ہوں جو ان کے ساتھ خیانت کی مرتکب ہو رہی ہوں۔''

کنول اپنا مسئلہ زبان پر لے ہی آئی۔ معظم نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور قدرے توقف کے بعد بولا۔

''تم غلط سوچتی ہو۔ اول تو ہمارے درمیان جو تعلق ہے اسے جرم کہا ہی نہیں جا سکتا۔ بے اختیاری میں قائم ہونے والا یہ تعلق بہت پاکیزہ بنیادوں پر قائم ہے۔ ہمارے تمہارے درمیان کبھی ایسا کچھ نہیں ہوا جس پر شرمسار ہو کر ہم خود کو مجرم تصور کریں۔ دوم یہ کہ اگر اس تعلق پر کوئی اعتراض کیا ہی جائے تو پھر بھی مجرم تم نہیں میں کہلاؤں گا۔ اس معاملے میں میری بیوی کے پاس صرف میرا احتساب کرنے کا حق ہے مگر یقین جانو کہ اس کی کبھی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ میری بیوی ان عورتوں میں سے نہیں ہے جو شوہر پر کسی دوسری عورت کا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ میں اگر اس سے بات کروں تو وہ خوشی مجھے اجازت دے دے گی کہ میں تمہارے اور اپنے تعلق کو قانونی اور شرعی رشتے میں تبدیل کر دوں۔ اس معاملے میں کوئی رکاوٹ ہے تو وہ خود میں ہوں۔ مجھے خود سے تیس چوبیس سال چھوٹی لڑکی کو اس حیثیت سے اپنی زندگی میں شامل کرنا عجیب لگتا ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ مجھ سے تمہارے معاملے میں کوئی حق تلفی نہ ہو جائے۔ میرا ساتھ تمہیں ان خوشیوں سے محروم نہ کر دے جو کسی ہم عمر جیون ساتھی کے ساتھ تمہیں مل سکتی ہیں۔ پھر ایک خیال یہ بھی آتا ہے کہ ہو سکتا ہے تم محض کسی وقتی جذبے سے متاثر ہو کر میری طرف متوجہ ہو گئی ہو..... بعد میں تمہیں اپنی حماقت کا خیال آئے۔ ایسی صورت میں محبت کے خوابوں کے ساتھ شروع ہونے والی زندگی جہنم بن جائے گی۔ اپنے اتنے خوبصورت تعلق کا ایسا بھیانک انجام برداشت نہیں ہو گا مجھ سے۔'' یہ پہلا موقع تھا کہ معظم اتنا کھل کر اس موضوع پر کنول سے بات کر رہا تھا۔ اس نے کنول سے متعلق اپنے احساسات بتانے کے ساتھ ساتھ اپنے خدشات بھی بیان کر دیے تھے۔

''مجھے آپ کی مسز کے بارے میں جان کر حیرت ہوئی کہ ایسی بھی خواتین ہوتی ہیں جو شوہر کے معاملے میں اتنی وسیع القلبی کا مظاہرہ کریں لیکن بہرحال ان کی یہ وسیع القلبی میرے لیے خوش آئند ہے۔ کم از کم میرے دل سے یہ بوجھ ہٹ گیا کہ میں ان کی دل آزاری کا سبب بنوں گی۔ اب رہی

آپ کی گفتگو کے دوسرے حصے کی بات تو میں آپ سے صرف یہ کہوں گی کہ آپ عمر میں مجھ سے تیئس چوبیس سال بڑے ہونے کے باوجود ایک بہت بڑی حقیقت نظر انداز کرنے کی غلطی کر رہے ہیں۔ خوشی کا تعلق انسان کے دل سے ہوتا ہے نہ کہ ہم عمری، خوبصورتی اور دولت وغیرہ سے۔ دل کی مراد پوری ہو جائے تو باقی چیزوں پر بہ خوشی سمجھوتا کر لیا جاتا ہے۔ عورت تو ایسے سمجھوتے، سمجھوتا سمجھ کر نہیں اپنی محبت کی معراج سمجھ کر بہت خوش دلی سے کر لیتی ہے۔'' کنول کی آواز اندرونی جذبات سے کپکپا رہی تھی۔ پھر وہ ایک دم ہی اپنی جگہ سے یوں اٹھی جیسے فوراً کمرے سے باہر نکل جائے گی لیکن باہر نکلنے سے قبل معظم کی میز پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا ٹھہرتے ہوئے بولی۔

''آپ کو لگتا ہے کہ میں محض وقتی جذباتیت کا شکار ہوں تو جس طرح چاہیں آزما کر دیکھ لیجیے گا میں جیسی انیس سال کی عمر میں ہوں آج سے انیس سال بعد بھی آپ مجھے ویسا ہی پائیں گے۔'' اس کا لہجہ اتنا مضبوط تھا کہ معظم اس کے اپنے آفس سے باہر نکل جانے کے بعد بھی بہت دیر تک اس کے لہجے کی پختگی کے احساس میں ڈوبا رہا۔ اس کی جہاندیدگی سمجھا رہی تھی کہ کنول منیر کا دعویٰ غلط نہیں وہ واقعی اپنے جذبوں میں بہت خالص تھی اور اس کا یہ خالص پن ہی معظم کو خوفزدہ کر دیتا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ جاتا تھا کہ اس جیسا زخم زخم اندر سے ٹوٹا ہوا، ڈھلتی عمر کا مرد جانے ان خالص جذبوں کی مالک لڑکی کے ساتھ انصاف کر بھی سکے گا یا نہیں؟

☆☆☆

بہت سارے دن خاموشی سے گزر گئے۔ مومو اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنی سالگرہ منا کر واپس مری جا چکی تھی۔ آفس کا کام روٹین کے مطابق چل رہا تھا۔ معظم کی وہی مصروفیات تھیں فیکٹری کے معاملات میں الجھا وہ اپنی ذات کے لیے بھی بہت کم وقت نکال پاتا تھا۔ کنول بھی اسے چھیڑے بنا اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف تھی۔ ایک طرف اسے گھر کے سدھرتے ہوئے حالات نے مطمئن کر رکھا تھا تو دوسری طرف معظم کے قریب رہنے کا احساس خوش رکھتا تھا۔ اس کی محبت نے بہت زیادہ کی طلب کبھی نہیں کی تھی۔ معظم کو روز دیکھ لینا اور اس کی آواز سن لینا ہی اس کے لیے بہت بڑی نعمت تھی۔ اس نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ اس تعلق کا انجام کیا ہوگا۔ اس کے سامنے یہ مسئلہ بھی نہیں تھا کہ معظم اسے اپنائے گا یا نہیں؟ وہ اپنے دل کے اس خوبصورت احساس کے ساتھ خوش تھی جو معظم کی محبت کی دین تھا۔ یہ احساس اتنا انوکھا، اتنا سرور انگیز تھا کہ کنول کو لگتا ساری دنیا اس کے قدموں کے نیچے ہے۔ ان ہی خوشیوں بھرے دنوں میں ایک دن اسے معظم کے چہرے پر پریشانی کے سائے نظر آئے۔

''خیریت تو ہے سر! آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ مومو تو ٹھیک ہے نا؟''

سیکریٹری کی حیثیت سے کنول کو علم تھا کہ فیکٹری کے تمام معاملات ٹھیک چل رہے ہیں ایسے میں اگر معظم پریشان تھا تو اس کا مطلب تھا کہ پریشانی نجی نوعیت کی ہے۔ نجی پریشانی کا خیال آتے ہی کنول کا دھیان سب سے پہلے مومو کی طرف گیا تھا چنانچہ اس نے اسی حوالے سے معظم سے سوال کیا۔

''مومو ٹھیک ہے مگر اس کی مما کی طبیعت بہت خراب ہے۔ کل رات ہی میں نے اسے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروایا ہے۔ ڈاکٹرز کا خیال ہے کہ اس کے پھیپھڑے بالکل جواب دے چکے ہیں۔ باقی وہ ابھی ٹیسٹ وغیرہ کر رہے ہیں اس کے بعد ہی کوئی حتمی رائے دیں گے۔'' معظم نے کنول کو بتایا۔

''ایسے اچانک کیسے ان کی طبیعت اتنی خراب ہوگئی؟ کیا پہلے بھی ان کے ساتھ کوئی پرابلم تھا؟''

کنول کو بھی اس خبر سے صدمہ ہوا تھا۔ اسے مومو کا برتھ ڈے ڈنر یاد آ گیا تھا۔ وہ جتنا ڈرتی ڈرتی اس ڈنر میں شرکت کے لیے گئی تھی معظم کی بیوی کے رویے نے وہ سارا ڈر ختم کر دیا تھا۔ کنول سے وہ بے حد محبت سے بالکل ایسے ملی تھی جیسے وہ اس کے گھر کی ہی ایک فرد ہو۔

''بیمار تو وہ اکثر ہی رہتی تھی لیکن اس کی بیماری اتنی شدت اختیار کر چکی ہے مجھے اندازہ نہیں تھا۔ شاید پچھلے بیس برسوں سے اسے اس حال میں دیکھ دیکھ کر میں عادی ہو گیا تھا جو اندازہ ہی نہیں لگا سکا کہ وہ کتنی شدید بیمار ہے۔ آج مجھے اپنی اس کوتاہی پر احساس جرم ہو رہا ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ خود اپنی پروا کبھی نہیں کرتی پھر میں نے اس کی پروا کیوں نہیں کی؟'' معظم کے چہرے پر حقیقی دکھ تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں سر! انشاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔'' کنول نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''تم دعا کرنا کنول! ورنہ میں مومو کو کیا جواب دوں گا؟ وہ مجھ سے شکوہ کرے گی کہ پاپا آپ نے میری مما کا خیال نہیں رکھا۔'' کنول کو لگا کہ معظم کی آنکھوں میں نمی سی ہے۔ اس سے قبل کہ کنول اس کی تسلی کے لیے مزید الفاظ ادا

کرتی معظم نے تیزی سے خود کو سنبھال لیا اور کنول کو ہدایت دی۔

''ذرا افتخار صاحب کو میرے پاس بھیجو۔ میں انہیں چند ضروری انسٹرکشنز دے کر دوبارہ ہاسپٹل جاؤں گا۔ ممکن ہے چند دن میں یہاں آ ہی نہ سکوں۔'' کنول نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور خود واپس اپنے کیبن میں آ گئی۔ معظم پندرہ بیس منٹ افتخار صاحب سے بات کرنے کے بعد وہاں سے روانہ ہو گیا۔ جانے سے پہلے اس نے کنول سے دوبارہ رابطہ نہیں کیا تھا۔ کنول نے اس بات کا برا نہیں مانا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ معظم کتنا پریشان ہے۔ وہ عورت جس کے ساتھ اس نے اپنی زندگی کے بیس برس گزارے تھے ہاسپٹل میں شدید بیمار پڑی تھی ایسے میں وہ کنول کو نظر انداز کر گیا تھا تو یہ شکایت کا مقام نہیں تھا۔ کنول تو خود بے حد مضطرب تھی۔ اسے رہ رہ کر معظم کی بیوی کا محبت بھرا رویہ یاد آ رہا تھا۔ وہ معظم کے ساتھ بے جوڑ لگتی تھی یا اس کی معظم کے ساتھ بہت زیادہ مضبوط ریلیشن شپ نظر نہیں آتی تھی۔ ان سب باتوں سے قطع نظر کنول اس سے دو ملاقاتوں کے بعد ہی اس بات کی معترف ہو گئی تھی کہ وہ ایک محبت کرنے والی، پُرخلوص عورت ہے۔ غور سے دیکھنے پر کنول کو اس بات کا بھی اندازہ ہوا تھا کہ وہ کبھی خوبصورت رہی ہو گی لیکن وقت اس کے حسن کو چاٹ گیا تھا۔ کنول نہیں جانتی تھی کہ معظم اور اس کی شادی کن حالات میں اور کیونکر ہوئی لیکن اسے اندازہ تھا کہ وہ حالات یقیناً غیر معمولی ہوں گے۔

کنول کا وہ سارا دن معظم کی بیوی کے بارے میں ہی سوچتے ہوئے گزرا۔ کاموں کی انجام دہی کے دوران اس کی ذہنی رو بار بار بھٹک کر اس کی طرف چلی جاتی اور وہ دل ہی دل میں اس کی صحتیابی کے لیے دعائیں کرنے لگتی۔

☆☆☆

''ہیلو، آپ معظم صاحب کی سیکریٹری مس کنول منیر بات کر رہی ہیں؟'' دوسرے دن کنول اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھی کہ لنچ ٹائم سے آدھا گھنٹا قبل فون کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھانے پر اس سے ایک نسوانی آواز نے استفسار کیا۔

''یس! میں معظم صاحب کی سیکریٹری کنول منیر بات کر رہی ہوں۔ آپ کون صاحبہ ہیں؟''

کنول نے تصدیق کرتے ہوئے فون کرنے والی سے اس کے بارے میں پوچھا۔

''میں مسز معظم کی اٹینڈنٹ ہوں۔ ان کے کہنے پر ہی میں نے آپ کو فون کیا ہے۔ مسز معظم کی خواہش ہے کہ آپ آج لنچ ٹائم میں ان سے ہاسپٹل آ کر ملاقات کریں۔''

نسوانی آواز نے اپنا مختصر تعارف کراتے ہوئے فون کرنے کا مقصد بیان کیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ جلد از جلد ہاسپٹل پہنچ جاؤں۔'' کنول کو حیرت تھی کہ معظم کی بیوی نے خاص طور پر اس سے ملاقات کی خواہش کیوں کی ہے لیکن اس حیرت کو ظاہر کیے بغیر اس نے فوراً ہی ہاسپٹل آنے کی ہامی بھر لی۔ یوں بھی وہ آج مسز معظم کی مزاج پرسی کے لیے شام میں امی کے ساتھ ہاسپٹل جانے کا ارادہ رکھتی تھی مگر اس خصوصی بلاوے کے بعد اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ ابھی اکیلی جا کر ملاقات کر لے اور امی کو پھر کسی دن لے جائے۔ ہاسپٹل، فیکٹری سے کافی فاصلے پر تھا۔ اندازاً کنول کو وہاں پہنچنے میں پون گھنٹا تو لگ ہی جاتا۔ کنول فون بند کر کے فوراً ہی افتخار صاحب کو بتا کر روانہ ہو گئی۔ روم نمبر وغیرہ وہ معلوم کر چکی تھی اس لیے ہاسپٹل پہنچ کر اسے اپنے مطلوبہ کمرے تک پہنچنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ صاف ستھرے کمرے میں، سینے تک سفید چادر اوڑھے معظم کی بیوی بستر پر نیم دراز تھی۔ کنول کمرے میں داخل ہوئی تو اس کا رخ دروازے کی طرف ہی تھا۔ کنول پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرائی پر اس مسکراہٹ سے بھی اس کی نقاہت ظاہر ہو رہی تھی۔ کنول کو وہ پہلی دو ملاقاتوں کے مقابلے میں بے حد کمزور محسوس ہوئی۔

''آؤ کنول! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' کنول کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس نے بہت خوش دلی اور بے تکلفی سے اس سے کہا۔

''مجھے افسوس ہے میم کہ آپ کو مجھے بلانے کی زحمت کرنی پڑی۔ اصل میں کل سراسنی جلدی میں تھے کہ میں ان سے ہاسپٹل وغیرہ کے بارے میں معلوم ہی نہیں کر سکی۔ آج آفس آنے کے بعد میں نے افتخار صاحب سے ساری انفارمیشن لی ہیں۔ ارادہ یہ تھا کہ شام میں گھر واپس جانے کے بعد اپنی امی کے ساتھ آپ کی مزاج پرسی کے لیے آؤں گی'' کنول نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے وضاحت دی۔

''میں نے کوئی شکایت تو نہیں کی۔ بس میرا دل چاہ رہا تھا تم سے ملنے کا اس لیے میں نے تمہیں بلوا لیا۔'' اس نے کہا تو کنول سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ یہ خیال اب بھی اس کے ذہن میں تھا کہ معظم کی بیوی نے اسے خاص طور پر کیوں بلایا ہے۔

''نرس! تم ایسا کرو کچھ دیر کے لیے باہر چلی جاؤ۔ یہ

کنول بہت پیاری لڑکی ہے اور مجھے یقین ہے کہ بہت اچھی اٹینڈنٹ ثابت ہوگی۔ جب تک یہ یہاں ہے تم میری طرف سے خود کو فارغ سمجھو۔''

کنول کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اس سے کچھ کہنے کے بجائے معظم کی بیوی نے نرس کو حکم دیا۔ نرس اثبات میں سر ہلاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ کنول کو اپنے اعصاب کشیدہ سے محسوس ہونے لگے۔ معظم کی بیوی کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اس سے کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہے اسی لیے نرس کو باہر بھیج کر پرائیویسی کا انتظام کیا گیا ہے۔

''سر کہاں ہیں؟ انہیں تو یہاں آپ کے پاس ہاسپٹل میں ہونا چاہیے تھا۔'' کنول کو کچھ اور سمجھ نہ آیا تو معظم کے بارے میں ہی پوچھ بیٹھی۔

''انہیں ان کے ایک دوست نے کسی بہت اچھے ڈاکٹر کے بارے میں بتایا ہے وہ میری رپورٹس لے کر اس ڈاکٹر سے ملاقات کے لیے گئے ہیں۔ بے چارے پچھلے بیس سال سے اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح میرے مردہ تن میں زندگی پھونک سکیں۔'' معظم کی بیوی کے چہرے پر گہری اداسی تھی۔

''آپ انشاءاللہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی میم! سر آپ کی بہت فکر کرتے ہیں۔ وہ آپ کا اچھے سے اچھا علاج کروائیں گے۔'' کنول نے اس زندگی سے مایوس بیمار عورت کو تسلی دینی چاہی۔

''مجھے معلوم ہے کہ معظم میری بہت فکر کرتے ہیں۔ ان کی فطرت ہی ایسی ہے۔ دوسروں کی بھلائی کی خاطر کسی بھی حد تک چلے جاتے ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں بہ یک وقت اداسی اور احترام کے رنگ تھے۔

''پتا ہے کنول! معظم اتنے اچھے، اتنے مہربان ہیں کہ میں ہر وقت اللہ سے یہ دعا مانگتی ہوں کہ اللہ ان کو زندگی کی سچی خوشیاں اور راحتیں عطا کرے۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار اپنے گھر میں دیکھا تو مجھے لگا میری دعائیں قبولیت کے درجے پر پہنچنے لگی ہیں۔ کچھ عرصے سے مجھے معظم کچھ بدلے بدلے اور خوش نظر تو آرہے تھے لیکن میں وجہ کا صحیح طرح اندازہ نہیں لگا سکی تھی۔ تمہیں دیکھا تو معظم کی خوشی کی وجہ سمجھ آگئی۔ جانتی ہو اتنے برسوں میں تم واحد لڑکی ہو جسے میں نے معظم کے ساتھ اپنے گھر آتے دیکھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم معظم کے لیے بہت خاص ہو۔ اسی لیے میں نے معظم کو تمہیں مومو کی سالگرہ پر بلانے کے لیے کہا۔ ڈنر کے دوران تمہارا مومو اور مجھ سے جو سلوک تھا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ تم بھی اپنے دل میں معظم کے لیے خاص جذبات رکھتی ہو۔ تمہاری کم عمری کے باعث مجھے جو خدشہ تھا کہ کہیں معظم اپنے جذبوں میں تنہا نہ ہوں، وہ اس ملاقات کے بعد دور ہو گیا۔ میں نے جان لیا کہ تم معظم کے لیے ایک بہترین ساتھی ثابت ہو گی۔ پھر تمہارا مومو سے پیار بھی میرے اطمینان کا باعث بنا۔ اگرچہ تم عمر میں اس سے چند برس ہی بڑی ہو لیکن میں سمجھ سکتی ہوں کہ تمہارے دل میں اس کے لیے ممتا ہے۔ تم میرے بعد، میری مومو کو وہ پیار دے سکو گی جو میں سگی ماں ہوتے ہوئے بھی اسے نہیں دے سکی۔'' اس کی آنکھوں میں نمی امڈ آئی تھی جسے وہ ٹشو پیپر سے صاف کرنے لگی۔ کنول تو اتنی شدید حیرت میں مبتلا تھی کہ اسے تسلی بھی نہیں دے سکتی تھی۔

''تم حیران ہو رہی ہوں گی کہ میں کیسی باتیں کر رہی ہوں یا یہ کہ میں نے ان سب باتوں کا اندازہ کیسے لگایا لیکن اگر تم میری عمر اور تجربے کو سامنے رکھو تو تمہاری حیرت دور ہو جائے گی۔ تم سے تو خیر میں بہت ہی زیادہ بڑی ہوں لیکن معظم بھی عمر اور تجربے میں مجھ سے کہیں کم ہیں۔ تم دونوں کی خاموشی کے باوجود میری تجربہ کار نگاہوں سے تمہارے دلوں کا حال چھپنا مشکل تھا۔ اگر میں غلط کہہ رہی ہوں تو تم میری بات کی تردید کر سکتی ہو۔''

اس نے کنول کی آنکھوں میں جھانکا۔ کنول نے جواب دینے کے بجائے نظریں جھکا لیں۔ یہ اس کا خاموش اعتراف تھا۔ معظم کی بیوی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اس نے کچھ اور کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر کھانسی کے شدید دورے نے اسے مہلت نہ دی۔ کنول جلدی سے اٹھ کر اس کی پیٹھ سہلانے لگی۔ پھر اس نے سائڈ میں رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر اسے پلایا تب کہیں جا کر اس کی حالت سنبھلی لیکن پھر بھی وہ فوری طور پر کچھ کہنے کے لائق نہیں ہو سکی اور تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موندتے ہوئے گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ پانچ منٹ بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور دوبارہ سلسلۂ گفتگو جوڑا۔

''یقین کرو کنول! تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ مجھے تمہارا معظم کی زندگی میں آنا بہت اچھا لگا ہے۔ تم ان سے کسی رشتے میں بندھ گئیں تو سب سے زیادہ خوشی مجھے ہو گی۔ البتہ میں یہ چاہتی ہوں کہ تمہیں اپنے اور معظم کے حوالے سے کچھ اہم باتیں بتا دوں۔''

''میں آپ کی وہ باتیں بعد میں سن لوں گی میم۔ ابھی آپ آرام کریں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔'' کنول نے اس کی حالت کے پیش نظر اسے بات کرنے سے روکنا

چاہا۔

''نہیں۔ میں ابھی تم سے سب کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ جانے زندگی مزید مہلت دے یا نہ دے۔ کم از کم مرنے سے پہلے میں معظم کا کچھ تو قرض ادا کر جاؤں۔'' اس کا انداز اٹل تھا۔ کنول بے بس سی ہوگئی۔

''میں عمر میں معظم سے پورے تیرہ سال بڑی ہوں۔ معظم سے میری شادی ایک حادثہ تھا۔ اس حادثے کی پرورش میرے پہلے شوہر شمس علی کے ایک حادثے میں معذور ہونے کے بعد شروع ہوئی۔ شمس علی کی معذوری اور گھر کی تنگدستی نے مجھے مجبور کیا کہ میں باہر نکل کر کچھ کمانے کی کوشش کروں۔ معظم کے والد جنہیں سب بڑے شاہ صاحب کہتے تھے کپڑے کی اس مل میں جہاں شمس علی معذور ہونے سے پہلے نوکری کرتا تھا، ٹھیکیدار تھے۔ شمس علی نے بڑے شاہ صاحب سے کہہ کر مجھے کھاتے کے کام میں نوکری دلوادی۔ ان دنوں معظم کی عمر یہی کوئی بائیس تیئیس سال تھی۔ بڑے شاہ صاحب کام سکھانے کی غرض سے انہیں اپنے ساتھ مل لے کر آتے تھے۔ ہم سب کام کرنے والی عورتیں معظم کو ان کے والد کی مناسبت سے چھوٹے شاہ صاحب کہہ کر پکارتی تھیں۔ ایک دن یوں ہوا کہ کام کے دوران شدید گرمی کی وجہ سے میری طبیعت خراب ہوگئی اور میں بے ہوش ہوگئی۔ ساتھی عورتوں نے پانی کے چھینٹے دے کر اور دوسری ترکیبوں سے مجھے ہوش دلایا۔ بڑے شاہ صاحب تک میرے بے ہوش ہونے کی خبر پہنچی تو انہوں نے مہربانی کرتے ہوئے مجھے چھٹی دے دی۔ اس وقت معظم کے دل میں جانے کیا نیکی آئی کہ انہوں نے مجھے اپنی گاڑی میں گھر پہنچانے کی پیشکش کردی۔ میرے پاس اس روز کرائے تک کے پیسے نہیں تھے اس لیے میں نے ان کی پیشکش قبول کرلی۔ گھر پر معظم کا میری سوتیلی بیٹی سے سامنا ہوگیا۔ اس کی عمر اس وقت یہی کوئی سولہ، ساڑھے سولہ برس ہوگی۔ بے حد معصوم اور پیاری لڑکی تھی۔ معظم کم عمر تھے ان کے دل کو میری سوتیلی بیٹی بھا گئی۔ وہ بہانے بہانے سے میرے گھر آنے لگے۔ میں ان کی دلچسپی کو سمجھ چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ اچھا ہے کہ میری بیٹی کا اتنے اچھے لڑکے سے رشتہ ہوجائے۔ میں نے معظم کے اپنے گھر آنے پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ وہ اکثر مجھے اپنی گاڑی میں گھر بھی چھوڑ دیتے۔ مقصد بس ایک نظر اسے دیکھنا ہوتا تھا لیکن شمس علی مرد تھا اس نے اس معاملے کو کسی اور نظر سے ہی دیکھنا شروع کردیا۔ شاید معذوری اور بے روزگاری نے اسے شکی بنادیا تھا۔ وہ مجھ پر طرح طرح کی پابندیاں لگانے لگا۔ اس کے کہنے پر میں نے ساڑھی چھوڑ کر شلوار قمیص پہننا شروع کردی، معظم کے ساتھ اس کی گاڑی میں گھر آنا چھوڑ دیا لیکن شمس علی مطمئن نہیں ہوا۔ اس میں کچھ ہاتھ محلے والوں کا بھی تھا جو اس کے کان بھرتے رہتے تھے۔ محلے کے مردوں کی خاص طور پر مجھ پر بڑی نظر رہتی تھی۔ وہ شمس علی کی معذوری اور ہماری مجبوری کا فائدہ اٹھا کر میرے حسن کو پانے کی کوشش کرتے رہتے تھے لیکن میں نے کبھی ان کی ایک نہ چلنے دی۔ مجھ سے انتقام لینے کے لیے انہیں یہی راہ سوجھی کہ شمس علی کے کان میرے خلاف بھرے جائیں۔ ان دنوں جب شمس علی نے مجھ پر معظم کے ساتھ آنے جانے پر پابندی لگا رکھی تھی میں معظم کے اصرار پر ان کے ساتھ خریداری کے لیے بازار چلی گئی۔ انہوں نے شمس علی کی بیٹی کے لیے مجھے کچھ تحفے دلائے کچھ چیزیں میں نے خود خریدیں۔ شمس علی سے میں نے کہہ دیا کہ یہ ساری چیزیں لنڈا بازار سے خریدی ہیں لیکن بدقسمتی سے ایک محلے دار افضل نے مجھے معظم کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ اس نے شمس علی کے کان بھر دیے۔ شمس علی نے غصے میں ساری چیزیں جلا ڈالیں۔ مجھے اس کے اس عمل پر بہت غصہ آیا لیکن تب بھی میں یہ نہیں سمجھی کہ شمس علی مجھ پر شک کررہا ہے۔ میرے ذہن میں تو بس اتنی بات تھی کہ شمس علی کی غیرت اپنے اور اپنے بچوں کے لیے کسی کی مدد لینا گوارا نہیں کرتی۔ اصل بات تو مجھے اس قیامت کے روز سمجھ آئی جب میں دو دن کے شدید بخار کے بعد چارپائی پر پڑی تھی۔ اس روز معظم میری طبیعت معلوم کرنے ہمارے گھر آئے۔ اتفاق سے شمس علی اور میرے دونوں بیٹے گھر سے باہر تھے۔ معظم کے آنے کے بعد میں نے منہ ہاتھ دھونے کے خیال سے چارپائی سے اٹھ کر غسل خانے تک جانا چاہا پر کمزوری اتنی تھی کہ پہلے ہی قدم پر لڑکھڑا گئی۔ اس وقت تنہا معظم ہی کمرے میں تھے۔ انہوں نے مجھے سنبھالا اور اٹھا کر بستر پر ڈالا۔ شمس علی اسی وقت دونوں بیٹوں کے ساتھ گھر آگیا۔ اس منظر کو دیکھ کر اس کے شک زدہ ذہن نے نہ جانے کیا مطلب نکالا کہ اس نے مجھے کھڑے کھڑے طلاق دے دی۔ وہ کیسا اذیت بھرا وقت تھا میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔''

کنول اب بھی اس کے چہرے پر موجود کرب کے سائے دیکھ رہی تھی لیکن جو کچھ اسے سنایا جارہا تھا وہ اتنا عجیب تھا کہ اس کی زبان گنگ ہوگئی تھی۔ وہ خود میں ہمت نہیں پارہی تھی کہ بیس سال پہلے گزرنے والے سانحے پر ہلکتی اس عورت کو کوئی دلاسہ دے سکے۔ بس اس نے اتنا کیا کہ گلاس میں پانی نکال کر اسے پلادیا۔ پانی پی کر اس نے دوبارہ اپنی

داستان چھیڑ دی۔ شاید وہ سب کچھ آج اور ابھی ہی بتا دینا چاہتی تھی۔

''شمس علی کے طلاق دیتے ہی میں بالکل سڑک پر آ گئی تھی۔ شہر بھر میں میرا کوئی عزیز نہیں تھا۔ ماں باپ انڈیا کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بیٹھے تھے جنہیں اگر خبر ہو بھی جاتی تو میری مدد کے لیے پاکستان آنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ ایسے وقت میں معظم نے مجھے سہارا دیا۔ میں کچھ دن ان کے ایک دوست کے گھر رہی۔ اس دوران معظم، شمس علی کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے لیکن اس نے ان کی کسی وضاحت پر یقین نہیں کیا۔ طلاق اس نے دے ہی دی تھی۔ کسی مسلک کے تحت مصالحت کی گنجائش نکالنے کی کوشش، شمس علی کے نہ ماننے کی وجہ سے بیکار گئی۔ اس وقت معظم نے مجھے اپنانے کا فیصلہ کیا۔ وہ خود کو میری بربادی کا ذمے دار سمجھتے تھے۔ اپنے اس جرم کا مداوا انہوں نے اس طرح کیا کہ ہر ایک کی مخالفت مول لے کر مجھے اپنا نام دے دیا۔ میری عدت مکمل ہوتے ہی میرا ان کے دوست کے گھر پر ان سے نکاح ہو گیا۔ معظم کے اپنے گھر والوں نے اس نکاح کی سخت مخالفت کی۔ رسوائی، بدنامی، بددعائیں کیا کیا نہ تھا جو ان دنوں ہمارے حصے میں آیا لیکن معظم کا حوصلہ تھا جو وہ اپنے فیصلے سے پیچھے نہ ہٹے۔ مجھے لوگوں کے طعنوں سے بچانے کے لیے وہ مجھے لے کر کراچی سے لاہور شفٹ ہو گئے۔ بڑے شاہ صاحب کی مہربانی تھی کہ انہوں نے ناراضی کے باوجود معظم کو ان کے حق سے محروم نہیں کیا اور انہیں ان کا حصہ دے دیا۔ یوں معظم نے نئے سرے سے محنت شروع کی۔ یہ جس فیکٹری میں تم آج کام کر رہی ہو معظم کو ورثے میں نہیں ملی انہوں نے برسوں جدوجہد کرنے کے بعد اسے قائم کیا ہے اور ان حالات میں جبکہ کچھ بھی ان کے حق میں نہیں تھا۔ اپنے گھر والے ناتا توڑ چکے تھے۔ شہر نیا تھا اور ساتھی کی صورت میں مجھ جیسی عورت جسے اپنے لٹنے کا ماتم کرنے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ طلاق ہوئی سو ہوئی، اصل صدمہ مجھے اپنے بیٹوں سے جدا ہونے کا تھا۔ شمس علی مجھے طلاق دینے کے بعد گھر بیچ کر بچوں کے ساتھ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا کہ پھر اس کا کوئی اتا پتا ہی نہ مل سکا۔ صدمے نے مجھے ادھ موا کر دیا۔ پھر چھ سال بعد مومو پیدا ہوئی۔ بجائے اس کے کہ میں اسے پا کر سنبھل جاتی میری حالت اور بگڑ گئی۔ مجھ پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ دیوانگی میں، میں نے دو ایک بار مومو کی جان لینے کی بھی کوشش کی۔ ان حالات میں معظم نے بچی کو سنبھالنے کے لیے ایک ملازمہ رکھ لی۔ میرا علاج بھی چلتا رہا۔ میں کافی حد تک ٹھیک بھی ہو گئی لیکن ڈپریشن کا مرض ہمیشہ رہا۔ میں مومو کو کبھی ماں جیسا پیار نہیں دے سکی۔ میری ہی وجہ سے معظم نے اسے ہمیشہ گھر سے دور رکھا کہ کہیں میرا رویہ اس کی شخصیت کو مسخ نہ کر دے حالانکہ وہ خود مومو سے بہت محبت کرتے ہیں۔ مومو کی دوری برداشت کرنا ان کے لیے بہت مشکل ہے۔ میں ان سب باتوں کو سمجھتی ہوں لیکن بس جانے کیا ہوتا ہے کہ خود پر قابو نہیں رکھ پاتی۔ بہت عرصہ ہوا میرے اندر جینے کی تمنا ختم ہو چکی ہے۔

''میری شدت سے خواہش ہے کہ میں معظم کی زندگی سے نکل کر انہیں آزاد کر دوں۔ اب لگتا ہے کہ اس خواہش کے پورے ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ میرے بعد تم، معظم اور مومو، تینوں مل کر آرام سے رہنا۔ مومو کو وہ پیار دینا جو میں اسے نہیں دے سکی اور اسے بتانا کہ اس کی ماں اس سے بہت محبت کرتی تھی مگر حالات کے ہاتھوں اس بری طرح بکھری کہ پھر کبھی خود کو سنبھال ہی نہ پائی۔ اگر تم معظم کی زندگی میں شامل ہو گئیں تو ان کی زندگی بھر کے دکھوں کا مداوا ہو جائے گا۔ میں مرتے مرتے اپنے ساتھ یہ اطمینان لے کر جاؤں گی کہ وہ شخص جس نے ہمیشہ مجھے صرف دیا، میری دعائیں اس کے حصے میں بھی خوشیاں لے آئیں۔ اگر تم نے معظم کا ساتھ قبول کرنے سے انکار کر دیا تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔ وہ شخص جس نے اپنی پوری جوانی قربان کر دی، جس کی وجہ سے میری بول چال سے لے کر، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے تک ہر طرح کے معیار بدل گئے زندگی میں ایک خوشی کا تو حق رکھتا ہے۔ کیا تم معظم کو یہ خوشی دو گی کنول؟'' معظم کی بیوی حسینہ جو کبھی اسم بامسمیٰ ہوا کرتی تھی لیکن آج صرف نام کی حسینہ رہ گئی تھی بڑی آس سے کنول سے پوچھ رہی تھی۔ کنول اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے گلے سے لگ گئی۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں سمائی ہوئی بری طرح بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ ان کے درمیان مزید ایک بھی لفظ کا تبادلہ نہیں ہوا تھا لیکن آنسوؤں کی زبان ہر ان کہی کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

''کیا بات ہے کنول؟ جب سے فیکٹری سے واپس آئی ہو چپ چاپ لیٹی ہو۔ وہاں کوئی مسئلہ ہو گیا ہے کیا؟'' حسینہ سے ملاقات کے بعد کنول کا سارا دن اس ملاقات میں ہونے والی گفتگو میں الجھا رہا تھا۔ کبھی اسے حسینہ کی زیرک نگاہی حیران کرتی جس نے محض دو ملاقاتوں میں اس کے اور معظم کے درمیان تعلق کی نوعیت کو سمجھ لیا تھا تو کبھی حسینہ کی درد

بھری داستان اس کی آنکھوں میں نمی لے آتی معظم کی ویران زندگی کا دکھ بھی وہ اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی مگر ساتھ ہی اس کی عظمت نے بھی اسے بری طرح متاثر کیا تھا۔ کیا تھا وہ شخص؟ ایک عورت کو بے اماں ہونے سے بچانے کے لیے اس نے اپنی خواہش، خوشی، حال، مستقبل سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ کچھ آسان تو نہ ہوگا اپنے سے تیرہ سال بڑی ایک ایسی عورت کے ساتھ زندگی گزارنا جس کی بے قرار مامتا نے اسے رفاقت کا حق ادا کرنے کے لائق ہی نہیں چھوڑا تھا پھر اس پر طرّہ یہ کہ اس عورت کا ساتھ معظم کو ہر دم اپنی اولین محبت کی یاد دلاتا رہا ہوگا۔ کنول جتنا ان سب باتوں کو سوچتی اس کا دل اتنا ہی دکھ سے بھر جاتا۔ فیکٹری سے گھر واپس آجانے کے باوجود وہ دکھ کی اس کیفیت سے نکل نہیں سکی تھی اور حسب معمول امی کا باورچی خانے میں ہاتھ بٹانے کے بجائے کمرے میں آکر لیٹ گئی تھی۔ اس کے اس خلاف معمول رویّے پر ہی امی تشویش میں مبتلا ہو کر اس سے پوچھ گچھ کرنے اس کے پاس چلی آئی تھیں۔

''فیکٹری میں کوئی مسئلہ نہیں ہے امی! البتہ اپنے باس کی مسز کے بارے میں، میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ آج میں فیکٹری سے ہی انہیں دیکھنے ہاسپٹل چلی گئی تھی۔ وہاں ان کی حالت دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا۔ وہ بہت شدید بیمار ہیں۔ خود ان کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی ہیں۔'' کنول نے بستر پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ماں کے لیے جگہ بناتے ہوئے اداسی سے بتایا۔

''بس بیٹا! یہی زندگی ہے۔ یہاں ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی دکھ لگا ہوا ہے۔ کہیں روپے پیسے کی کمی تو کہیں رشتوں کی بے مہری۔ جو اس طرف سے آسودہ ہیں انہیں بیماری اور دوسری پریشانیاں گھیر لیتی ہیں۔ سمجھو ان دکھوں اور پریشانیوں کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ جب تک سانس ہے دکھ سکھ کی آنکھ مچولی جاری رہتی ہے۔'' ان کے لہجے میں زندگی بھر کا تجربہ بول رہا تھا۔

''میرے باس بہت اچھے انسان ہیں۔ انہوں نے زندگی کے سارے دکھ بہت اعلیٰ ظرفی سے برداشت کیے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان جیسے اچھے انسان کی زندگی میں بار بار یہ دکھ اور پریشانیاں کیوں چلی آتی ہیں!'' کنول کے لہجے میں الجھن تھی۔

''آزمائش ہمیشہ نیک اور اچھے لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ اللہ نے انہیں اعلیٰ ظرف عطا کیا ہے تو پھر اس ظرف کی آزمائش بھی تو ہوگی۔ بہرحال یہ معاملہ تمہارے دخل دینے کی یا اعتراض کرنے کی باتیں نہیں۔ ہر بندے کا اللہ سے اپنا تعلق ہوتا ہے اس تعلق کی بنیاد پر ہی اللہ اس کی دنیاوی اور آخروی زندگی کے لیے فیصلے کرتا ہے۔ ہم تم اگر کچھ کر سکتے ہیں تو وہ یہ کہ ان دونوں زندگیوں میں ان کی بھلائی کے لیے دعا کریں۔'' کنول قائل ہونے والے انداز میں اپنی امی کی باتیں سن رہی تھی۔

''کل ایسا کرنا کہ فیکٹری سے واپس آنے کے بعد مجھے اپنے ساتھ ہاسپٹل لے چلنا۔ میں بھی ان خاتون کی عیادت کر لوں گی۔ اب تم اٹھو اور منہ ہاتھ دھو کر بہن بھائی کے ساتھ بیٹھو۔ کھانا تقریباً تیار ہے تھوڑی دیر بعد کھا لیں گے پھر تم عشا کی نماز کے بعد خوب دل لگا کر اپنے باس کی بیگم کے لیے دعا کرنا۔ اس سے تمہیں بھی سکون ملے گا اور اللہ ان کے لیے بھی بہتری عطا فرمائے گا۔'' امی نے نصیحت کی جس پر عمل کرنے کے ارادے سے کنول نے بستر چھوڑ دیا۔

☆☆☆

''آپ اندر چل کر مسز معظم سے ملیں امی! میں ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔'' حسینہ کے کمرے کے دروازے پر رک کر کنول نے اپنی امی سے کہا اور پھر خود تیزی سے پلٹ کر شفاف برآمدہ عبور کرتی ہوئی اس حصے میں آگئی جہاں بیضوی شکل کے کاؤنٹر کے سامنے چند آرام دہ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ امی کے ساتھ یہاں سے گزرتے ہوئے اس نے معظم کو ایک بینچ پر اس حالت میں بیٹھے دیکھا تھا کہ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سر پشت کی دیوار سے ٹکا ہوا تھا۔ کنول نے معظم کے چہرے پر موجود پریشانی کے آثار دور سے ہی دیکھ لیے تھے اسی لیے امی کو اس کی طرف متوجہ کیے بغیر انہیں وہاں سے گزار کر سیدھی حسینہ کے کمرے تک لے آئی لیکن خود اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ معظم کو اس حال میں دیکھنے کے بعد ایک پل کے لیے بھی کہیں اور ٹھہر سکتی اس لیے خود دروازے سے ہی واپس پلٹ گئی۔ معظم اب بھی اسی پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا۔ کنول دھیرے سے اس سے کچھ فاصلے پر بینچ پر ٹک گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی معظم نے تیزی سے آنکھیں کھولیں شاید اس نے کنول کی اپنے قریب موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ کنول نے دیکھا کہ معظم کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

''سب ٹھیک تو ہے سر؟ آپ کی مسز ...'' کنول نے دل میں ابھرتے اندیشے کا ادھورے جملے میں اظہار کیا۔

''وہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔

رپورٹس کے مطابق اسے لنگ کینسر ہے وہ بھی بالکل آخری اسٹیج پر۔ میں دو دن سے مسلسل ڈاکٹروں کی پیچھے دوڑ رہا ہوں کئی ماہرین سے رابطہ کر چکا ہوں لیکن سب کا ایک ہی جواب ہے کہ اب کچھ نہیں کیا جا سکتا بہت دیر ہو گئی ہے۔'' معظم دھیمی آواز میں اسے بتانے لگا۔ کنول کو لگا کسی نے اس کا دل مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔ حسینہ معظم کے حوالے سے اسے بہت عزیز تھی۔ پھر اس سے کل ہونے والی ملاقات کے بعد تو وہ اس کے لیے اپنے دل میں بہت زیادہ محبت اور ہمدردی محسوس کر رہی تھی اس پیاری عورت کے بارے میں اس دل دہلا دینے والے انکشاف نے کنول کو گنگ کر دیا تھا۔

''بہت زیادتی کی حسینہ نے میرے ساتھ۔ ہمارے تعلق کی نوعیت جیسی بھی تھی اسے کم از کم مومو کے بارے میں تو سوچنا چاہیے تھا۔ کیا جواب دوں گا میں مومو کو جب وہ مجھ سے پوچھے گی کہ اس کی مما اس حال تک کیسے پہنچیں؟ وہ تو یہی سمجھے گی ناں کہ میں نے اس کی ماں کا خیال نہیں رکھا اسے یہ کون بتائے گا کہ اس کی ماں کے دل میں جینے کی امنگ ہی نہیں تھی۔'' معظم بے حد اپ سیٹ لگ رہا تھا۔ کنول کو یکدم احساس ہوا کہ اس وقت معظم کو کسی کے سہارے کی اشد ضرورت ہے اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا۔ یہ وقت خود ہاتھ پیر چھوڑ کر بیٹھنے کے بجائے معظم کو حوصلہ دینے کا تھا۔

''آپ غلط سوچ رہے ہیں سر! مومو بہت سمجھدار لڑکی ہے وہ جانتی ہے کہ آپ کتنے محبت کرنے اور خیال رکھنے والے شخص ہیں وہ اپنی مما کی بیماری کے لیے کبھی بھی آپ کو بلیم نہیں کرے گی اور پھر ہم یہ سوچیں ہی کیوں کہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ یہاں کے ڈاکٹرز نے اگر جواب دے دیا ہے تو ہم بیرونِ ملک کسی اچھے ڈاکٹر سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس جدید ٹیکنالوجی اور یہاں سے بہتر علاج کی سہولتیں ہیں ممکن ہے وہاں کچھ بات بن جائے۔ پھر سب سے بڑھ کر تو آپ مسیحائی کر سکتے ہیں۔ آپ اگر اپنی مسز کو یقین دلائیں کہ آپ کو ان کی ضرورت ہے، آپ زندگی بھر انہیں اپنے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں تو ان کی زندگی کے لیے بجھ جانے والی امنگ ایک بار پھر زندہ ہو سکتی ہے۔'' کنول بہت خلوص سے معظم کو سمجھا رہی تھی۔ معظم نے تہ دل سے اس چھوٹی سی لڑکی کے خلوص کو محسوس کیا جو ایک ایسی عورت کے لیے جس سے اس کا رقابت کا رشتہ بنتا تھا زندگی کی امید روشن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میرے لیے حسینہ کے دل میں زندگی کی امنگ پیدا کرنا ممکن نہیں اگر یہ بات میرے بس میں ہوتی تو وہ اس حال کو ہی نہیں پہنچتی۔ مگر تم یہ بات نہیں سمجھ سکتیں۔ بہت کچھ ایسا ہے جو تم نہیں جانتیں۔'' معظم نے شکستہ لہجے میں کنول کی بات کا جواب دیا۔

''اگر میں کہوں کہ میں بہت کچھ جانتی ہوں تو پھر.....؟'' کنول کے بے حد سنجیدہ لہجے پر معظم نے چونک کر اسے دیکھا۔

''یہ سچ ہے سر! میں آپ کے اور آپ کی مسز کے ماضی کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔ انہوں نے کل ہی مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ آپ دونوں کا کوئی دکھ، کوئی پریشانی مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ وہ سب جو اتنے دنوں میں آپ مجھے نہیں بتا سکے انہوں نے محض تیسری ملاقات میں مجھے بتا ڈالا صرف اس لیے کہ وہ آپ کو خوش دیکھنا چاہتی ہیں۔ انہیں آپ کی فکر ہے۔'' کنول، معظم کو کل ہاسپٹل میں حسینہ سے اپنی ملاقات کی ساری تفصیلات بتاتی چلی گئی۔ معظم آنکھوں میں حیرت لیے سب کچھ سنتا رہا۔

''یہ سب سن کر آپ کو یقین کرنا پڑے گا سر کہ وہ بھی آپ سے محبت کرتی ہیں بس حالات نے انہیں کبھی اس محبت کے اظہار کا موقع نہیں دیا۔ دوسرے وہ آپ کے احسان کے بوجھ تلے اتنی دب گئیں کہ انہوں نے خود کو کبھی آپ کی محبت کا حقدار نہیں سمجھا۔ اسی ذہنی کشمکش میں نہ تو وہ کبھی آپ کو اپنی محبت دے سکیں اور نہ ہی کبھی آپ کی محبت میں اپنا حصہ مانگ سکیں لیکن انہیں جس طرح آپ کی فکر ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ آپ سے کتنی محبت کرتی ہیں۔ انسان بنا محبت کے یوں کسی کو خوش دیکھنے کے لیے ہلکان نہیں ہوتا۔ خصوصاً ایک بیوی جب اپنے شوہر کو کسی دوسری عورت سے بانٹنے کے لیے تیار ہو تو سمجھ لیں وہ کس انتہا درجے کی محبت کرتی ہے اپنے شوہر سے کہ اپنی ذات کو بھی پس پشت ڈالنے کو تیار ہے۔'' کنول کی باتیں معظم کے دل میں ایک نیا عزم جگا رہی تھیں۔ وہ جو مایوس ہو چکا تھا ایک بار پھر حسینہ کی زندگی کی جنگ لڑنے کے لیے اپنے ہتھیار سنبھالنے کو تیار ہو گیا۔

☆☆☆

وہ دونوں عورتیں ایک دوسرے کے بالکل آمنے سامنے موجود ہونے کے باوجود پہلی نظر میں ایک دوسرے کو شناخت نہیں کر سکی تھیں۔ شناخت کے مرحلے میں درپیش آنے والی اس مشکل کی ایک وجہ تو وہ درمیانی بیس سال تھے جو ان کی آخری ملاقات سے اس حالیہ ملاقات کے درمیان حائل رہے تھے لیکن دوسری اور بڑی وجہ ان دونوں میں آنے والی واضح تبدیلیاں تھیں۔ یہ تبدیلیاں صرف ماہ و سال کے سبب

نہیں تھیں۔ ان کے پیچھے وہ حالات بھی تھے جن سے وہ دونوں گزشتہ بیس سال میں گزری تھیں۔ ان میں سے ایک کو اگر غم اور ذہنی تناؤ نے بستر مرگ پر پہنچادیا تھا تو دوسری کو غربت وافلاس اور بے سہارا پن نے اس حال کو پہنچادیا تھا کہ وہ اپنی عمر کا پانچواں عشرہ مکمل ہونے میں چند سال باقی ہونے کے باوجود عمر رسیدہ نظر آتی تھی۔

''ناجیہ تم......؟'' پہچان کا مرحلہ بستر پر دراز بڑی عمر کی عورت نے پہلے طے کیا تھا۔

''آپ......'' جواباً ناجیہ نام کی وہ عورت جو کنول کی ماں تھی، فقط یہی ایک لفظ اپنی زبان سے ادا کرسکی تھی۔ اور پھر بستر پر اٹھ بیٹھنے والی حسینہ کی کھلی بانہوں میں جا سمائی تھی۔ حسینہ، ناجیہ کو بے تحاشا چومتے ہوئے زار وقطار رو رہی تھی۔

''آپ مجھے معاف کردیں۔ میری محبت میں آپ کو بہت دکھ اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔'' ناجیہ نے روتے ہوئے برسوں سے سینے پر دھرا بوجھ اتارا۔

''معافی کیسی؟ جو کچھ ہوا اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں تھا بلکہ شاید کسی کا بھی قصور نہیں تھا۔ ساری خرابی تو میری تقدیر کی تھی۔ میری خراب تقدیر نے اوروں کی بھی قسمت بگاڑدی۔'' حسینہ کی آواز میں برسوں کی تھکن تھی۔

''مگر میں ہمیشہ خود کو آپ کا مجرم سمجھتی رہی۔ میری تقدیر سنوارنے کی کوشش میں ہی تو، آپ ابا کے عتاب کا نشانہ بنیں۔ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ مجھے ابا کو سچ بتانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ پھر جب آپ کے چھوٹے شاہ صاحب سے نکاح کی خبر ملی تو مجھے احساس ہوا کہ اب کسی بھی طرح کی صفائی دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نکاح کی خبر نے ابا کے شک کو اور بھی مضبوط کردیا تھا۔ وہ مکان کا سودا پہلے ہی کر چکے تھے۔ ہم لوگ ان کی خواہش پر کراچی چھوڑ کر سکھر چلے گئے۔ بس پھر اس کے بعد ہمیں آپ کے بارے میں کبھی کوئی اطلاع نہیں ملی۔'' جذبات کا چڑھا دریا کچھ اتر گیا تھا اور ناجیہ اپنے آنسوؤں پر قابو پاکر قدرے پُرسکون لہجے میں حسینہ کے سامنے وضاحتیں پیش کررہی تھی۔

''ان سب باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ میرے انور اور اظہر کیسے ہیں؟ اب تو وہ دونوں بہت بڑے ہوگئے ہوں گے۔ شادیاں ہوگئیں ان دونوں کی یا نہیں؟'' وقت اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ حسینہ کے لیے یہ ساری وضاحتیں بے معنی تھیں البتہ اس کی تڑپتی ہوئی ممتا کو اپنے بچھڑ جانے والے بیٹوں کا حال جاننے کی آج بھی روزِ اول جیسی ہی بے قراری تھی۔

''وہ دونوں ٹھیک ہیں۔ دونوں کی شادی ہوگئی ہے۔ انور ملک سے باہر ہے، اظہر یہیں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ دونوں ماشاءاللہ خوش ہیں۔'' ناجیہ نے حسینہ کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

''دونوں مجھے یاد تو کرتے ہوں گے؟'' حسینہ نے آس سے ناجیہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ نظر چرا گئی۔ کیا بتاتی کہ وہ دونوں تو ماں کا نام بھی بھولے سے بھی زبان پر لانے کو گناہ سمجھتے ہیں۔ جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا اور جو کچھ بعد میں شمس علی نے انہیں باور کروایا تھا اس کے بعد ان کے دلوں میں ماں کے لیے نفرت کے سوا کوئی جذبہ نہیں رہا تھا۔ ناجیہ کے نظر چرا لینے سے حسینہ نے صورتحال کو سمجھ لیا اور ایک گہرا سانس لیتے ہوئے موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

''تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ تمہاری شادی کب ہوئی؟ کتنے بچے ہیں؟ اور یہ تم وقت سے پہلے ہی اتنی بوڑھی کیوں لگنے لگی ہو؟''

''میری شادی تو ابا نے سکھر پہنچتے ہی فوراً کردی تھی۔ میرا شوہر ایک سبزی فروش تھا جس کی عمر مجھ سے بہت زیادہ تھی۔ مگر بہرحال اس نے اپنی حیثیت کے مطابق مجھے زندگی کی ساری خوشیاں دینے کی کوشش کی۔ ابا اور انور، اظہر کو بھی اپنے ساتھ ہی گھر میں رکھا۔ ابا کا میری شادی کے پانچ سال بعد ہی انتقال ہوگیا تھا۔ پھر انور کے میٹرک کرنے کے بعد ہم اس کے اصرار پر سکھر سے یہاں لاہور آگئے۔ یہاں پر بھی میرے شوہر نے سبزی کی دکان کھول لی۔ ہمارا گزارا اچھا ہوجاتا تھا۔ میں اپنے تینوں بچوں کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہی تھی مگر پھر میرے شوہر کو دمے کا مرض ہوگیا اور اس مرض نے اس کی جان لے لی۔ انور، اظہر نے اپنے طور پر کچھ دن ہماری مدد کی مگر زندگی بھر کون کسی کو بھرتا ہے۔ انور کا دبئی میں اپنا گھر بار بیوی بچے ہیں، اظہر کی بھی میں نے شادی کروادی تھی وہ اپنے بیوی بچوں کے مسئلوں میں الجھ گیا۔ مجھے سلائی کا کام تو آتا ہی تھا بس اسی ہنر کے سہارے گھر چلتا رہا مگر اس مشقت اور بے سہارا پن نے میری صحت کو کھالیا۔ شکر ہے مالک کا کہ بڑی والی بچی قابل نکلی۔ آج کل اسی نے گھر کا خرچہ سنبھالا ہوا ہے۔ اسی کی وجہ سے تو آج میں یہاں پہنچی ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ اس کے باس کی مسز بیمار ہیں انہیں دیکھنے اسپتال جانا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں آپ سے سامنا ہوجائے گا۔'' ناجیہ نے مختصراً اپنے حالات زندگی سنائے اور پھر یکدم چونکی۔

''اس کا مطلب ہے کہ چھوٹے شاہ صاحب ہی میری بچی کے باس ہیں۔''

''تمہاری بیٹی کا کیا نام ہے؟'' ناجیہ کے خیال کی تصدیق کرنے کے بجائے حسینہ نے بے قراری سے سوال کیا۔

''کنول، کنول منیر ہے میری بیٹی کا نام۔ آپ تو جانتی ہوں گی اسے!'' ناجیہ کے جواب نے حسینہ کے بدترین خدشے کی تصدیق کر دی۔ وہ یکدم ہی نڈھال ہو کر بستر پر گر سی گئی۔

''کیا ہوا؟'' کیا طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے؟ میں ڈاکٹر کو بلواؤں؟'' ناجیہ اس پر جھک کر گھبرائی گھبرائی سی پوچھنے لگی۔

''ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ معظم ایک بار پھر خوشی سے محروم ہو جائے یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔'' ناجیہ کو کوئی جواب دینے کے بجائے حسینہ بے خودی کے عالم میں بڑبڑا رہی تھی۔

''ہیلو میم! کیا حال ہے آپ کا؟ کب تک بستر چھوڑنے کا ارادہ ہے؟'' ناجیہ، حسینہ کی بڑبڑاہٹ سے کوئی نتیجہ اخذ کرتی اس سے قبل ہی کنول چہکتی آواز میں بولتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

''میری امی سے تو آپ مل ہی لی ہوں گی میم! میں اصل میں باہر سر سے کچھ بات کرنے کے لیے رک گئی تھی وہ کسی کام سے گئے ہیں تو میں یہاں آئی ہوں۔'' کنول، خود ہی بولتی جا رہی تھی۔ حسینہ کی طرف سے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا جا رہا تھا۔

''کنول! تم ڈاکٹر کو بلاؤ۔ مجھے لگتا ہے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' ناجیہ نے کنول سے کہا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس کچھ دیر اکیلی رہنا چاہتی ہوں۔'' کنول کے حرکت میں آنے سے قبل ہی حسینہ بول پڑی۔ اس کی بات کا واضح طور پر یہ مطلب تھا کہ ناجیہ اور کنول کو اب وہاں سے چلے جانا چاہیے۔ وہ دونوں کچھ دیر تذبذب کا شکار وہاں کھڑی رہنے کے بعد کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اسپتال سے روانہ ہونے سے قبل کنول ڈیوٹی نرس کو حسینہ کے کمرے میں بھیجنا نہیں بھولی تھی۔

☆☆☆

''سنبل! مجھے ڈائری میں سے انور ماموں کا فون نمبر لکھ کر دے دو۔ مجھے انہیں فون کرنا ہے۔'' گھر واپس جانے کے بعد ناجیہ نے چھوٹی بیٹی کو حکم دیا تو کنول چونک گئی۔ حسینہ سے ملاقات کے بعد اسے ماں کھوئی کھوئی سی نظر آ رہی تھی۔ کنول کو خیال گزرا کہ حسینہ نے امی سے اس کے اور معظم شاہ کے حوالے سے کوئی تذکرہ کیا ہے جب ہی وہ اس قدر الجھی ہوئی نظر آ رہی ہیں مگر ایسی صورت میں تو انہیں سب سے پہلے کنول سے بات کرنی چاہیے تھی انور ماموں کو فون کرنے کی تو کوئی تک ہی نہیں بنتی تھی۔ اسے بے چینی سی ہونے لگی۔

''انور ماموں کو فون کیوں کر رہی ہیں؟'' اندر کی بے چینی نے اسے ماں سے سوال کرنے پر مجبور کیا۔

''کیوں؟ کوئی پابندی ہے کیا؟ میرا بھائی ہے جب چاہے اس سے بات کر سکتی ہوں۔'' ناجیہ بچوں کے سامنے ماضی کے معاملات نہیں کھولنا چاہتی تھی اس لیے قدرے جارحانہ رویہ اختیار کر کے کنول کو زبان بندی پر مجبور کر دیا۔ اس دوران سنبل ایک کاغذ پر انور کا فون نمبر لکھ لائی تھی۔

''دروازہ بند کر لو اور ہاں تم لوگ کھانا کھا لینا مجھے واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ انور کو فون کرنے کے بعد میں تھوڑی دیر کے لیے اظہر کے گھر بھی جاؤں گی۔'' چادر سر پر جما کر باہر نکلتے ہوئے ناجیہ نے ہدایت دی۔ کنول کے چہرے پر نظر آنے والے سوالوں اور الجھن کو اس نے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ اس وقت اسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اس عورت کے لیے کچھ کر سکے جس نے ماضی میں اس پر بہت احسانات کیے تھے آج وہ عورت بستر مرگ پر پڑی تھی اور ناجیہ اس کے لیے کچھ نہ سہی مگر اتنا تو کر سکتی تھی کہ اس کی تڑپتی ہوئی ممتا کو سکون پہنچانے کی کوشش کر سکے۔ اسی مقصد کے لیے وہ انور کو فون کرنے جا رہی تھی۔ گھر سے کچھ فاصلے پر موجود پی سی او پر پہنچ کر اس نے وہاں ملازم لڑکے کو انور کا دبئی کا فون نمبر دیا۔ کال ملنے کے لیے اسے بیس منٹ تک انتظار کرنا پڑا تھا۔ بیس منٹ بعد اس نے لائن پر انور کی آواز سنی۔

''انور! آج میری اماں سے ملاقات ہوئی تھی۔'' رسمی علیک سلیک اور خیر خیریت معلوم کرنے کے مرحلے سے گزرنے کے بعد ناجیہ نے آہستہ سے انور کو بتایا۔

''کون اماں؟ ہماری کوئی ماں نہیں ہے اور تمہاری ماں کو مرے ہوئے بہت سال گزر گئے۔'' انور جو پہلے ہی ناجیہ کے فون کرنے پر تھوڑا حیران تھا اس کی بات سن کر بالکل کٹھور بن گیا۔

''نظر چرانے سے حقیقت بدل نہیں جاتی انور! تم مانو یا نہ مانو لیکن یہ سچ ہے کہ اس زمین پر ایک عورت ایسی ہے جو تمہیں اس دنیا میں لانے کا سبب ہے اور تم اس کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے۔''

''میں مانتا ہوں کہ ایک عورت مجھے اس دنیا میں لانے

کی ذمے دار ہے لیکن میں اس عورت کو اپنی ماں نہیں مان سکتا۔ وہ اس لائق ہی نہیں کہ اسے اس مقدس رشتے سے پکارا جائے۔''

انور کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''وہ مر رہی ہے انور! اس کی ویران آنکھیں تمہیں اور اظہر کو دیکھنے کے لیے ترس رہی ہیں۔'' ناجیہ نے انور کے اندر حسینہ کے لیے ہمدردی جگانے کی کوشش کی۔

''ہمارے لیے وہ بہت سال پہلے ہی مر چکی ہے مگر مجھے تم پر حیرت ہے آپا کہ تم ساری حقیقت جاننے کے باوجود کیسے اس عورت کی حمایتی بن بیٹھی ہو؟'' انور کے لہجے میں درد تھا۔

''میں ساری حقیقت جانتی ہوں تب ہی تو ان کی طرف داری کر رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ انہیں جس قصور کی سزا ساری زندگی ملتی رہی انہوں نے وہ جرم کیا ہی نہیں تھا۔'' ناجیہ نے انور کو سچائی بتانے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیسی سزا؟ غربت کی زندگی کو اولاد سمیت ٹھکرا کر ایک عیش بھری زندگی گزارنے والوں کو بھلا کیا معلوم کہ سزا کیا ہوتی ہے؟ سزا تو ہم نے بھگتی ہے ساری زندگی۔ بدنام ہوئے، دربدر پھرے۔ بچپن کی خوبصورتیاں کھو کر محنت اور مشقت کی چکی میں پسے۔ کیا جرم تھا ہمارا؟ صرف یہی نا کہ ہم نے ایک ایسی عورت کے بطن سے جنم لیا جو بدکردار تھی۔'' انور کے لہجے میں زہر کی سی تلخی تھی۔

''نہیں ہے وہ بدکردار عورت۔ کبھی کوئی جرم نہیں کیا اس نے۔'' انور کی بات سن کر ناجیہ چیخ پڑی لیکن لائن بے جان تھی۔ انور نے اس کی مزید بات سننے سے قبل سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ ناجیہ نے مرے مرے ہاتھوں سے ریسیور کریڈل پر ڈالا اور کالر کو پرائیویسی فراہم کرنے کے لیے بنائے گئے کیبن سے باہر نکل کر باہر موجود لڑکے کو اس طویل کال کی ادائیگی کی۔ اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسو وہ کیبن سے باہر آنے سے پہلے ہی اپنی چادر کے پلو سے صاف کر چکی تھی۔

اب اس کی اگلی منزل اظہر کا گھر تھا۔ اظہر کے گھر پہنچ کر اس نے اتنا انتظار کیا کہ اسے اظہر سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل سکے۔ اظہر کی بیوی باورچی خانے میں گئی تب اسے یہ موقع ملا۔ انور کی طرح اظہر بھی اس کی بات سن کر ہتھے سے اکھڑ گیا۔ انور کی نسبت وہ مزاجاً بھی قدرے تیز تھا اس لیے ناجیہ کو اسے دلائل کے ذریعے قائل کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ وہ اظہر کے گھر سے واپس لوٹی بہت دلگرفتہ تھی لیکن اس نے سوچ رکھا تھا کہ ایک بار پھر دونوں بھائیوں کو قائل کرنے کی کوشش ضرور کرے گی۔

☆☆☆

''امی! باہر دروازے پر ایک گاڑی کھڑی ہے۔ ڈرائیور کہتا ہے آپ سے بات کرنی ہے۔'' ناجیہ باورچی خانہ سمیٹنے کے بعد دوپہر کا کھانا چڑھانے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ سنبل نے اسے اطلاع دی۔ ناجیہ باورچی خانے سے نکل کر حیران سی بیرونی دروازے پر پہنچی۔ واقعی وہاں ایک شاندار گاڑی اور باوردی ڈرائیور موجود تھا۔ ''آپ ہی ناجیہ بیگم ہیں؟'' ناجیہ کو دروازے پر دیکھ کر ڈرائیور نے پوچھا۔

''مجھے مسز معظم نے بھیجا ہے کہ آپ کو اپنے ساتھ لے کر ہاسپٹل آجاؤں۔'' ناجیہ کی طرف سے تصدیق ہونے پر ڈرائیور نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

''تم ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' ناجیہ ڈرائیور کو جواب دے کر اندر آئی اور جلدی جلدی ہاسپٹل جانے کی تیاری کرنے لگی۔

''تم دوپہر کے کھانے کے لیے تھوڑی سی کھچڑی بنالینا۔ شام کے لیے میں واپس آکر خود ہی کچھ کرلوں گی۔'' چادر اوڑھ کر باہر نکلتے ہوئے اس نے سنبل سے کہا اور گاڑی میں جا بیٹھی گھر سے ہاسپٹل تک کا سارا راستہ اس نے حسینہ کے بلاوے کے بارے میں سوچتے ہوئے گزارا یقیناً برسوں بعد اپنے بچوں سے ملنے کی آس نے اسے بے چین کر دیا ہوگا اسی لیے اس نے ناجیہ کو بلایا تھا کہ ناجیہ ہی وہ واحد ہستی تھی جو اس کام میں اس کی مدد کر سکتی تھی۔

''مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گی۔'' ہاسپٹل پہنچ کر جیسے ہی ناجیہ، حسینہ کے کمرے میں داخل ہوئی حسینہ نے مسکراتے لبوں سے یہ جملہ ادا کیا۔ ناجیہ دیکھ سکتی تھی کہ حسینہ کی مسکراہٹ بھی بے حد نقاہت زدہ تھی۔

''میں کیسے نہیں آتی۔ ایک میں ہی تو ہوں جو آپ کا درد صحیح معنوں میں سمجھ سکتی ہوں۔'' ناجیہ نے حسینہ کا ہاتھ محبت سے تھامتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''تمہیں اس طرح اچانک بلائے جانے پر زحمت تو ہوئی ہوگی لیکن میں نے بہت سوچ سمجھ کر اس وقت کا انتخاب کیا ہے۔ اس وقت معظم فیکٹری گئے ہوئے ہیں اور میری خواہش تھی کہ ان کی غیر موجودگی میں تم سے ملاقات کروں۔ فی الحال تمہارا اور ان کا سامنا ہونا مناسب نہیں۔'' حسینہ نے معذرت خواہانہ انداز میں ناجیہ کو یوں اچانک بلائے جانے کی وضاحت دی۔

''آپ فکر مت کریں مجھے بالکل بھی زحمت نہیں ہوئی۔ رہی چھوٹے شاہ صاحب سے سامنا ہونے کی بات تو مجھے اس کی فکر نہیں۔ گزرے ہیں سالوں میں بہت کچھ بدل گیا ہے۔ نوعمری کے ان جذبات کا اب دل میں نام ونشان بھی نہیں رہا اور مجھے یقین ہے کہ یہی حال چھوٹے شاہ صاحب کا ہوگا۔ کچی عمر میں دل میں ابھرنے والے جذبوں کے رنگ بھی کچے ہی ہوتے ہیں جو زیادہ دیر ٹھہر نہیں پاتے۔'' ناجیہ کے لہجے میں بڑا اعتماد تھا۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتی تھی کہ حسینہ کس پریشانی میں مبتلا ہے۔

''مجھے معلوم ہے کہ گزرے وقت نے بہت کچھ بدل دیا ہے اور نوعمری کی وہ بات تمہارے اور معظم دونوں ہی کے دلوں سے مٹ چکی ہے۔ اس بات کی وجہ سے میں نے احتیاط کا راستہ اختیار بھی نہیں کیا۔ اس احتیاط پسندی کے پیچھے تو نئے حالات اور واقعات ہیں اور ان حالات کی سنگینی ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اتنی زیادہ کہ مجھے کوئی حل بھی نہیں سوجھ رہا لیکن میں بس ایک بات جانتی ہوں، مجھے معظم کو ان کے حصے کی خوشی دلانی ہے اور انہیں یہ خوشی دینا تمہارے تعاون کے بغیر ممکن نہیں اسی لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔'' حسینہ کیا سمجھانا چاہ رہی ہے، ناجیہ کے لیے یہ سمجھنا آسان نہیں تھا۔ وہ وضاحت طلب نظروں سے حسینہ کو دیکھنے لگی۔

''حالات نے عجیب ہی موڑ لیا ہے۔ میں موت کی دہلیز پر کھڑی ہوں اور ایسے موقع پر محبت نے ایک بار پھر معظم کے دل پر دستک دی ہے۔ معظم کی زندگی میں آنے والی یہ تبدیلی کل سے پہلے میرے لیے بے حد خوش کن تھی۔ مجھے اطمینان تھا کہ میرے ساتھ گزرے ویران اور تھکا دینے والے سالوں کے بعد زندگی ان کے لیے ایک بڑی خوشی لے کر آنے والی ہے لیکن کل تمہیں کنول کی ماں کی حیثیت سے سامنے پا کر میرا سارا اطمینان رخصت ہو گیا ہے۔ مجھے لگا کہ معظم کی زندگی میں آنے والی خوشی کی راہ میں ایک بار پھر ایک بڑی رکاوٹ کھڑی ہو گئی ہے اور یہ رکاوٹ ایسی ہے کہ اسے دور کرنے کے لیے مجھے، تمہیں، معظم اور کنول سب کو غیر معمولی جرأت سے کام لینا ہوگا۔'' حسینہ بہت ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات کہہ رہی تھی پھر بھی اس کا سانس پھول گیا تھا۔

''میں سمجھ نہیں پا رہی کہ آپ کس رکاوٹ کی بات کر رہی ہیں جو چھوٹے شاہ صاحب کی خوشی کے راستے میں کھڑی ہے اور جسے دور کرنے کے لیے ہم سب کو جرأت کرنی ہوگی۔ میں تو یہ سمجھی تھی کہ آپ نے مجھے انور اور اظہر سے ملنے کی خواہش میں یہاں بلایا ہوگا لیکن آپ جانے کون سا قصہ چھیڑے بیٹھی ہیں؟'' ناجیہ کو حسینہ کی باتوں نے بری طرح الجھا دیا تھا۔

''انور اور اظہر میری اولاد ہیں۔ برسوں ان کی خاطر تڑپتے ہوئے گزارے ہیں میں نے لیکن یہ بھی جانتی ہوں کہ شمس علی نے میرے بیٹوں کے دل میں میرے لیے اتنا زہر بھر دیا ہوگا کہ وہ میری شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کریں گے اور موجودہ حالات میں تو میں خود بھی ان سے نہیں ملنا چاہتی۔ جہاں اتنے برس ان کے بغیر گزر گئے یہ آخری چند دن بھی گزر ہی جائیں گے۔ مجھے تو اس وقت سب سے زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ معظم کے زندگی بھر کے احسانات کا قرض کسی طرح ادا ہو سکے۔ میں دنیا سے جاتے جاتے انہیں ایک تحفہ دینا چاہتی ہوں لیکن اس تحفے کے لیے مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔'' ناجیہ نے دیکھا تھا کہ انور، اظہر کے ذکر پر حسینہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے لیکن اس نے کمالِ ضبط سے کام لیتے ہوئے ان آنسوؤں پر قابو پا لیا تھا۔

''وہ کیا تحفہ ہے جو آپ میری مدد کے بغیر چھوٹے شاہ صاحب کو نہیں دے سکتیں!'' حسینہ کی کیفیت کے پیشِ نظر ناجیہ نے بہت محبت سے اس سے دریافت کیا۔

''کنول۔ تمہاری بیٹی کنول منیر۔'' حسینہ کے جواب نے ناجیہ کو گنگ کر دیا۔

☆☆☆

''میں نے مومو کو اس کے اسکول سے بلوا لیا ہے۔ اس کی اسٹڈیز ڈسٹرب تو ہوں گی لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ کچھ دن اپنی ماں کے قریب گزار لے۔ لندن کے ایک ہاسپٹل سے میں نے حسینہ کے علاج کے سلسلے میں رابطہ کیا ہے۔ بہت زیادہ تو نہیں لیکن تھوڑی سی امید دلائی ہے ان لوگوں نے۔ میں حسینہ کو لندن لے جانے کے انتظامات کر رہا ہوں جب تک ہم لوگ روانہ نہیں ہو جاتے مومو یہاں رہ لے گی۔'' معظم تھکے تھکے سے انداز میں کنول کو بتا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی اس کے رتجگوں اور پریشانی کی غماز تھی۔

''یہ آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا سر! مومو کو سامنے پا کر میڈم کے اپنے اندر بھی زندہ رہنے کی خواہش پیدا ہو گی۔ علاج کے لیے مریض کے اندر اس خواہش کا ہونا بہت ضروری ہے۔ رہا مومو کی اسٹڈیز کا مسئلہ تو میرے خیال میں وہ کافی ذہین لڑکی ہے تھوڑے بہت نقصان کو آسانی سے کور کر لے گی اور اگر نہ بھی کر سکی تو مجھے یقین ہے کہ اسے اس بات کا افسوس نہیں ہوگا۔ اولاد کے لیے ماں باپ کی زندگی کی

اہمیت اپنے کیریئر سے زیادہ ہوتی ہے۔'' کنول نے معظم کے فیصلے کو سراہتے ہوئے اسے تسلی بھی دی۔

''کل میں سارا دن بہت مصروف رہوں گا اس لیے مومو کو ائرپورٹ لینے جانا ممکن نہیں ہوگا۔ اگر تم ڈرائیور کے ساتھ اسے ائرپورٹ لینے چلی جاؤ تو مجھے تسلی رہے گی۔''

''آپ فکر نہ کریں سر! میں چلی جاؤں گی۔'' معظم کی بات سن کر کنول نے اسے یقین دہانی کروائی پھر خیال آنے پر پوچھنے لگی۔

''مومو میڈم کے بارے میں جانتی ہے؟ آئی مین یہ کہ وہ اتنی شدید بیمار ہیں اور آپ انہیں علاج کے لیے لندن لے جانے والے ہیں؟''

''میں فون پر اسے یہ سب نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے اس کی چھٹی کے لیے اپلیکیشن بھجوانے کے ساتھ اس کی پرنسپل سے استدعا کی تھی کہ وہ مومو کو صورتحال سے باخبر کر دیں۔ اس کی پرنسپل ایک نہایت سمجھدار، ہمدرد اور معاملہ فہم خاتون ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مومو کو بہت مناسب لفظوں میں حالات سے آگاہ کر دیں گی۔'' معظم نے دھیمی آواز میں بتایا تو کنول گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ کوئی کتنے ہی مناسب الفاظ استعمال کرے کسی بیٹی کے لیے یہ سننا کہ اس کی ماں موت کی دہلیز پر کھڑی ہے کبھی بھی آسان نہیں ہو سکتا۔

''جن فائلز وغیرہ پر میرے دستخط لینا ضروری ہیں وہ لے آؤ تاکہ میں یہاں سے نکل سکوں۔ مجھے لندن روانگی کے سلسلے میں ابھی بہت کام کرنا ہے۔'' معظم نے یکدم ہی گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کنول کو حکم دیا تو وہ چونکی۔

''اہم فائلیں میں نے پہلے ہی آپ کی ٹیبل پر رکھ دی ہیں۔ آپ انہیں دیکھ لیں۔ اس دوران میں آپ کے لیے کھانا لگواتی ہوں۔'' کنول کہتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

''کھانا رہنے دو۔ میرا موڈ نہیں ہے کچھ بھی کھانے کا۔'' معظم نے اسے منع کیا۔

''موڈ ہے یا نہیں کھانا تو آپ کو کھانا ہوگا کیونکہ کھانے کے بغیر آپ کے اندر کام کے لیے توانائی پیدا نہیں ہو سکتی اور آدمی جب خود ہی ناتواں ہو تو دوسرے کے لیے کیا کر سکتا ہے۔''

کنول استحقاق سے کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ معظم کے فارغ ہونے تک وہ پیون کی مدد سے ٹیبل پر کھانا لگوا چکی تھی۔

''تم بھی آجاؤ۔'' معظم نے اسے پکارا تو وہ چپ چاپ اس کے ساتھ کھانے میں شامل ہو گئی لیکن خود کھانے سے زیادہ اس کا زور معظم کو کھلانے پر تھا۔ وہ غیر محسوس طور پر معظم کی پلیٹ میں کچھ نہ کچھ ڈالتی جا رہی تھی۔ معظم جس نے کئی دنوں سے ڈھنگ سے کھانا نہیں کھایا تھا خواہش محسوس نہ کرنے کے باوجود بھی اچھا خاصا کھا گیا۔ دراصل جسم کو تو بھرپور خوراک کی ضرورت تھی لیکن اپنی پریشانیوں میں الجھا وہ اس ضرورت کو مسلسل ٹالتا آرہا تھا اب جو کنول نے توجہ دی تو اسے پتا بھی نہیں چلا اور اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا۔

''تھینک یو کنول۔'' کھانے کے بعد پیون سبز چائے سرو کر کے گیا تو اس وقت معظم نے ممنون نظروں سے کنول کو دیکھتے ہوئے یہ دو لفظ ادا کیے۔

''کیا آپ کے اور میرے درمیان اس طرح کے الفاظ کی ادائیگی کی گنجائش نکلتی ہے؟'' کنول نے قدرے خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے یہ بات کہی تو اس کے اپنائیت بھرے انداز پر معظم کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ چھوٹی سی لڑکی اللہ کی طرف سے اس کے لیے ایک خاص تحفہ ہے جس کا ساتھ ہونا ہی دل کو بہت سکون دیتا ہے۔

☆☆☆

''سر کو چند بہت ضروری کام نمٹانے تھے اس لیے وہ خود تمہیں ریسیو کرنے نہیں آسکے اور مجھے بھیج دیا۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنے پاپا کی مجبوری کو سمجھ لوگی۔'' ائرپورٹ پر مومو کو ریسیو کرتے ہوئے اس کی متلاشی نگاہوں کے جواب میں کنول نے یہ بات کہی تھی۔

''میں سمجھتی ہوں مس کنول۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے پاپا مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اتنے سالوں میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ مجھے ریسیو کرنے نہ آئے ہوں اگر آج نہیں آسکے تو اس کا مطلب ہے وہ سچ مچ بہت بزی ہیں۔'' مومو نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور پارکنگ ایریا کی طرف قدم بڑھا دیے۔ کنول اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

''کیا ہم یہاں سے سیدھے ہاسپٹل جائیں گے؟'' گاڑی ائرپورٹ کی حدود سے نکلی تو مومو نے کنول سے یہ سوال کیا۔

''نہیں۔ فی الحال ہم گھر جائیں گے۔ میڈم کے اس وقت کچھ ضروری ٹیسٹ وغیرہ ہونے ہیں اس لیے ہاسپٹل جانا بے کار ہے اگر ہم وہاں چلے بھی گئے تو ان سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ سر نے مجھے یہی ہدایت کی تھی کہ مومو کو گھر لے جانا تاکہ وہ فریش ہونے کے بعد اپنی مما سے ملنے ہاسپٹل

آ سکے۔'' کنول نے نرمی سے جواب دیا تو مومو نے تنبیہی انداز میں سر کو جنبش دے کر خاموشی اختیار کر لی۔ کنول کے لیے اس کا ردعمل حیرت انگیز تھا وہ سمجھ رہی تھی کہ مومو سیدھی ہاتھ چل جانے پر اصرار کرے گی اور اسے مومو کو قائل کرنے کے لیے کافی جدوجہد کرنی پڑے گی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھداری اور ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ شاید ضبط کا یہ ہنر اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ معظم شاہ کی شخصیت کا ٹھہراؤ دیکھ کر بھی تو کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ شخص اپنی زندگی میں کن بڑے بڑے طوفانوں سے گزرتا رہا ہے۔ گھر تک کا سارا راستہ خاموشی میں گزرا۔ مومو گم صم تھی تو کنول کو بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا بات کرے۔

''تم فریش ہو کر آؤ۔ میں یہیں لاؤنج میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔'' ایک ملازم کے ذریعے مومو کا بیگ اس کے کمرے میں بھجوانے کے بعد کنول نے اس سے کہا تو اس نے دیگر باتوں کی طرح کنول کی اس ہدایت پر بھی عمل کیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ بیس منٹ بعد مومو کمرے سے باہر نکلی تو کنول ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگوا چکی تھی۔

''آجاؤ مومو کھانا کھالو۔'' کنول اس کا ہاتھ تھام کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھی۔

''پلیز مس کنول! میرا موڈ نہیں ہے۔'' مومو نے پہلی بار کنول کی کسی بات کو ماننے سے انکار کیا۔

''موڈ نہیں ہے تب بھی تھوڑا سا کھالو۔ تمہارے پاپا نے کک کو خاص طور پر تمہاری پسند کا کھانا بنانے کا حکم دیا تھا۔ انہیں پتا چلے گا کہ تم نے کھانا نہیں کھایا تو انہیں دکھ بھی ہوگا اور وہ پریشان بھی ہوں گے۔ پہلے ہی میڈم کی وجہ سے بہت پریشانی ہے کیا تم پسند کرو گی کہ تمہاری وجہ سے ان کی پریشانی میں اضافہ ہو؟'' کنول نے اسے سمجھاتے ہوئے سوال کیا تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے یکدم ہی رو پڑی۔ کنول نے دکھی دل کے ساتھ اسے گلے لگالیا۔ مومو کتنے ہی ضبط کا مظاہرہ کرتی..... تھی تو بہرحال ایک چھوٹی سی لڑکی۔

''میری مما ٹھیک ہو جائیں گی نا مس کنول؟''

''کیوں نہیں۔ اچھی امید رکھو اور اللہ سے دعا کرتی رہو۔ اللہ بڑا مہربان ہے وہی فیصلے کرتا ہے جو آدمی کے حق میں بہتر ہوتے ہیں۔'' مومو کے پوچھنے پر کنول نے اسے دلاسہ دیا پھر اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے سمجھانے لگی۔

''تمہیں بہت بہادری کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ تم حوصلہ کرو گی تو تمہارے مما اور پاپا کو بھی حوصلہ ملے گا۔ سر نے خاص طور پر تمہیں اس لیے یہاں بلوایا ہے کہ تمہیں دیکھ کر تمہاری مما کی دل میں جینے کی امنگ پیدا ہو۔ تمہیں چاہیے کہ ان کے لندن روانہ ہونے سے پہلے جتنے دن یہاں ان کے ساتھ رہو ان سے بہت اچھے موڈ میں بات کرو تاکہ انہیں احساس ہی نہ ہو کہ وہ اتنی زیادہ بیمار ہیں۔ مریض کے اچھے علاج کے لیے اچھے ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ اچھے تیماردار کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور تمہیں اپنی مما کے لیے بہت اچھی تیماردار بن کر دکھانا ہے۔'' کنول کی باتیں مومو کے اندر حوصلہ پیدا کر رہی تھیں۔ جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور کنول کے دوبارہ کہنے پر اس کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھی۔ بہت رغبت سے نہ سہی پر اس نے تھوڑا بہت کھانا بھی کھالیا۔ کنول کے حساب سے اتنا بھی بہت تھا۔

☆☆☆

''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں معظم!'' مختلف ٹیسٹوں کے تھکا دینے والے عمل سے گزرنے کے بعد حسینہ کو واپس کمرے میں پہنچایا گیا تو اس نے معظم سے خواہش ظاہر کی۔

''تم جو کہو میں سننے کے لیے تیار ہوں مگر بہتر ہے کہ ابھی کچھ دیر تم آرام کرلو۔'' معظم نے اس کی حالت کے پیش نظر مشورہ دیا۔

''نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ مجھے آرام کی ضرورت نہیں۔ یوں بھی وقت کا کچھ معلوم نہیں جانے مجھے بعد میں آپ سے کچھ کہنے کی مہلت مل بھی سکے یا نہیں۔'' حسینہ نے جواب دیا۔

''ایسا کیوں سوچتی ہو؟ میں انتظامات کر تو رہا ہوں جلد تمہیں لندن لے جاؤں گا۔ وہاں یہاں سے زیادہ علاج کی سہولتیں ہیں۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' معظم نے اسے امید دلانی چاہی۔

''لندن والے کتنے ہی ترقی یافتہ سہی پر مہلت ختم ہونے پر زندگی بخش دینا تو ان کے اختیار میں بھی نہیں۔'' حسینہ کے ہونٹوں پر یاسیت بھری مسکراہٹ ابھری۔

''چھوڑو ان فضول باتوں کو اور وہ کہو جو تم مجھ سے کہنا چاہتی ہو۔'' معظم نے حسینہ کی آنکھوں میں بجھتی زندگی کی چمک سے نظر چراتے ہوئے اسے ٹوکا اور خود اس کے قریب بیٹھ کر اس کی بات سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''سب سے پہلے تو میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ میری وجہ سے آپ کی زندگی کے کئی بہترین سال ضائع ہو گئے اور بدلے میں، میں آپ کو کچھ بھی نہیں دے

سکی۔'' حسینہ کے لہجے میں حقیقی دکھ تھا۔

''مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں۔ پھر تم نے مومو کی صورت میں مجھے جو خوشی دی ہے اس کو پا کر میرے دل میں اگر کوئی شکوہ تھا بھی تو وہ دور ہو گیا۔'' معظم نے نرمی سے اسے جواب دیا۔

''یہ تو آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ آپ زندگی بھر کی تکلیفوں کے بعد بھی ایسی سوچ رکھتے ہیں لیکن میں خود اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتی کیونکہ میں نے ہمیشہ خود غرضی کا مظاہرہ کیا۔ میری سب سے بڑی خود غرضی تو آپ کی طرف سے نکاح کی پیشکش کو قبول کر لینا تھا۔ اس وقت میں نے صرف یہ سوچا کہ میں کہاں جاؤں گی۔ میرے ماں باپ اتنی دور تھے۔ نہ میرے پاس ان کے پاس جانے کے وسائل تھے اور نہ ہی میں طلاق یافتہ کی حیثیت سے ان کے سامنے جانے کا حوصلہ رکھتی تھی اس لیے میں نے اپنے مفاد کی خاطر آپ سے شادی کر لی۔ مگر میرا ذہن اس شادی کو کبھی قبول نہیں کر سکا۔ اپنے بچوں کی یاد نے مجھے کبھی ڈھنگ سے آپ کے گھر میں بسنے ہی نہیں دیا۔ اپنے غم میں چور مجھے کبھی احساس نہیں ہوا کہ آپ نے کتنی مخالفتیں اور بدنامیاں مول لے کر مجھے تحفظ دیا ہے۔ میں نے تو آپ کی قربانی کے صلے میں اتنی بڑی زیادتی کی کہ اپنی ہی بچی کو اس کا حق نہیں دے سکی۔ وہ بیچاری ماں کے ہوتے ہوئے بھی اس کی ممتا سے محروم رہی۔''

حسینہ کا گلا رندھ گیا تھا۔ عمر بھر کی غلطیاں آج پچھتاوا بنی اسے اعتراف پر مجبور کر رہی تھیں۔

''میں نے کہا ہے نا کہ مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں۔ پھر کیوں کرید رہی ہو ماضی کی ان تکلیف دہ باتوں کو۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب آگے کے بارے میں سوچو۔'' معظم نے ایک بار پھر ہمدردی سے اسے ٹوکا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں اب آگے کے بارے میں ہی سوچنا چاہیے اور سچ یہ ہے کہ میں کر بھی یہی رہی ہوں۔ میرے اپنے سامنے تو کوئی مستقبل نہیں مگر آپ کے اور مومو کے مستقبل کی مجھے بہت فکر تھی۔ کنول کو دیکھ کر مجھے لگا کہ یہ فکر بھی دور ہو گئی۔ وہ بہت سمجھدار لڑکی ہے۔ آپ سے بہت محبت کرتی ہے۔ آپ کی خاطر مومو کا بھی بہت خیال رکھے گی۔'' حسینہ کہہ رہی تھی اور معظم آنکھیں پھاڑے اس کی بات سن رہا تھا۔

''حیران ہو رہے ہیں کہ مجھے یہ سب کیسے معلوم ہوا لیکن حیرانی کی کیا بات ہے میں سال کے ساتھ میں اتنا تو آدمی ایک دوسرے کو سمجھ لیتا ہے۔ کنول کے آنے کے بعد

میں نے آپ کے چہرے پر جو رونق دیکھی وہ میں سالوں میں کبھی مجھے دکھائی نہیں دی۔ میں نے جان لیا کہ اس لڑکی کا آپ کے دل میں بڑا خاص مقام ہے اور یقین کریں مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوئی ہے۔ آپ کو بھی حق ہے زندگی کی خوشیاں حاصل کرنے کا۔'' معظم کی حالت دیکھ کر حسینہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''پتا نہیں یہ حق مجھے کوئی دے گا بھی یا نہیں۔ وہ مجھ سے عمر میں اتنی چھوٹی ہے کہ میں خود شعوری طور پر اس کے بارے میں سوچنے سے گھبراتا ہوں۔ یہی خیال آتا ہے کہ اس کے گھر والے اور دیگر لوگ کیا سوچیں گے۔ دنیا طعنے دے گی کہ معظم شاہ نے اس عمر میں لڑکی پسند بھی کی تو خود سے تیئس چوبیس سال چھوٹی۔'' حسینہ کو ہمدرد پا کر معظم اس سے اپنی الجھن شیئر کرنے لگا۔

''دنیا والوں کی فکر نہ کریں۔ آدمی کو اصل فکر یہ ہونی چاہیے کہ اللہ کا قانون نہ ٹوٹے الحمدللہ آپ اور کنول کے رشتہ جڑنے میں شریعت کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوتی معاشرتی اصولوں سے آدمی بغاوت کرسکتا ہے اور میرے خیال میں جہاں دو انسانوں کی خوشی کا معاملہ ہو وہاں کسی کھوکھلے اصول کو توڑ دینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ آپ وعدہ کریں معظم کہ آپ دنیا کی خاطر خود کو خوشیوں سے محروم نہیں کریں گے۔ اپنی خاطر نہ سہی میری خاطر آپ کو کنول سے شادی کرنی ہوگی اور کچھ نہیں تو یہ سوچ کر کہ یہ ایک مرتے ہوئے انسان کی آخری خواہش ہے۔'' حسینہ بے حد جذباتی ہوگئی تھی۔

''تم اپنی زندگی سے مایوس نہ ہو حسینہ! تم ٹھیک ہوجاؤ گی۔'' معظم نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔

''مجھے اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کرنی۔ مجھے صرف آپ سے یہ سننا ہے کہ حالات کتنے ہی ناموافق ہوں آپ کنول کو ضرور اپنائیں گے۔'' حسینہ اپنے مطالبے پر ڈٹی ہوئی تھی۔

''میں اکیلا یہ وعدہ کیسے کرسکتا ہوں؟ یہ صرف میرے اختیار کی تو بات نہیں۔'' معظم بے بس سا ہوکر حسینہ کو اپنی مجبوری سمجھانے لگا۔

''آپ وعدہ کریں باقی ہر معاملہ میں خود دیکھ لوں گی۔'' حسینہ کا اصرار جاری رہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔'' بالآخر معظم نے ہتھیار ڈال دیے۔

''شکریہ معظم! اب جو کچھ ہو اسے یہ سوچ کر قبول کرلیجیے گا کہ میرے ہر عمل میں میرا بھرپور خلوص شامل ہے۔

زندگی میں بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جنہیں قبول کرنا انسان کے لیے بظاہر ناممکن ہوتا ہے لیکن ذرا سی جرات اور روشن خیالی ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے۔'' حسینہ کی یہ باتیں کن آنے والے حالات کے لیے باندھی گئی تمہید تھیں معظم نہیں جانتا تھا۔ یوں بھی اس کی توجہ حسینہ کی طرف سے ہٹ کر کنول کے ساتھ اندر داخل ہوتی مومو کی طرف مبذول ہوگئی تھی۔ وہ لپک کر بیٹی کو گلے لگانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

''یس کم ان۔'' دستک کے جواب میں مومو کی آواز سن کر کنول نے دروازے کی ناب گھمائی اور بے آواز دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوگئی۔

''اوہ آپ!'' کنول کو سامنے پا کر مومو کے منہ سے نکلا۔ ''جی جناب میں، آپ سنائیے کیا ہو رہا ہے؟ یہ اب تک بستر کیوں نہیں چھوڑا گیا؟'' کنول بے تکلفی سے مومو کے قریب ہی بیڈ پر جا بیٹھی۔

''بس، وہ رات کو نیند بہت دیر سے آئی تو صبح آنکھ نہیں کھل سکی۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی اٹھنے کا۔'' مومو نے کنول سے نظریں چرا کر لہجے میں بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ حالانکہ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ بہت دیر تک روتی رہی ہے۔ اس کے چہرے پر اس تازگی کی بھی جھلک نہیں تھی جو بھرپور نیند لینے کے بعد جھلکتی ہے۔ اگر وہ سوئی بھی تھی تو بہت کم دورانیے کے لیے۔ کنول کی اس وقت یہاں آمد کی وجہ بھی مومو ہی تھی۔ ایک گھنٹے قبل لنچ ٹائم میں اس نے آفس سے فون کرکے مومو کے بارے میں معلوم کیا تھا تو اسے یہ اطلاع ملی تھی کہ مومو رات کو اپنے کمرے میں جانے کے بعد دوبارہ باہر نہیں نکلی۔ اس نے نہ ناشتا کیا تھا اور نہ ہی لنچ۔ ملازموں کی دستک کے جواب میں ہر بار ''ڈونٹ ڈسٹرب می'' کہہ کر انہیں واپس کردیتی تھی۔ ملازم پریشان تھے۔ معظم شاہ علی الصباح گھر سے روانہ ہوتے وقت انہیں مومو کا خیال رکھنے کی تاکید کرکے گئے تھے لیکن مومو کسی کو لفٹ ہی نہیں کروا رہی تھی۔ صورتحال جاننے کے بعد کنول نے فوراً ہی مومو کے پاس آنے کا فیصلہ کیا اور یہ خوش قسمتی ہی تھی کہ مومو نے اس کی دستک کے جواب میں اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اگر وہ اجازت نہ بھی دیتی تو کنول اندر ضرور جاتی۔ معظم شاہ کی بیٹی بھوکی پیاسی تنہا کمرے میں بند رہے یہ وہ کسی صورت بھی گوارا نہیں کرسکتی تھی۔

''تم نہا کر فریش ہونے کے بعد نیچے آجاؤ۔ میں اس دوران کچن کا جائزہ لیتی ہوں کہ کیا پکا ہے۔'' مومو کی حالت

پر کوئی بھی تبصرہ کیے بغیر کنول نے نارمل انداز میں اس سے کہا اور بیڈ سے اٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی مومو نے بھی بستر چھوڑ دیا۔

''ویسے محترمہ آپ بتادیں کہ کیا لینا پسند کریں گی، بریک فاسٹ یا لنچ تاکہ میں اسی کے مطابق ٹیبل سیٹ کروادوں۔'' کمرے سے نکلنے سے پہلے کنول نے مومو سے پوچھا۔

''دونوں کا مکسچر۔ اب یہ آپ کا امتحان ہے کہ آپ مجھے کیا کھلاتی ہیں۔'' مومو نے بے ساختگی سے جواب دیا تو کنول مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچن میں آکر جائزہ لینے پر اسے اندازہ ہوا کہ کافی کچھ تیار تھا یقیناً معظم کی ہدایت پر مومو کے لیے خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ کنول کا دل چاہا وہ خود اپنے ہاتھ سے مومو کے لیے کچھ بنائے۔ یہ بڑی بے ساختہ خواہش تھی۔ وہ خود سے چند سال چھوٹی مومو کے لیے دل میں ممتا کا جذبہ پھوٹتا محسوس کررہی تھی اور ایسا یقیناً معظم کی وجہ سے تھا۔ وہ معظم کو اپنے دل میں جو مقام دے چکی تھی اس کے بعد مومو کے لیے ایسے جذبات محسوس کرنا کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ اپنی اندرونی کیفیت کے زیراثر اس نے کچن کا جائزہ لیا۔ کک نے مٹن پلاؤ، شامی کباب اور قیمے پر مشتمل کھانا تیار کیا تھا اور اب کنول کی ہدایت پر ان چیزوں کو مائیکروویو میں گرم کرنے رکھ رہا تھا۔

''گوندھا ہوا آٹا ہے؟'' کنول نے کچھ سوچتے ہوئے کک سے استفسار کیا۔

''یس مس۔ اگر آپ کہیں تو میں ابھی تازہ پھلکے بنادیتا ہوں لیکن بے بی رائس زیادہ شوق سے کھاتی ہیں۔'' کک نے مستعدی سے جواب دیا۔

''نہیں پھلکے بنانے کی ضرورت نہیں، بس مجھے فرج میں سے آٹا نکال دو۔'' کنول نے کک کو حکم دیا اور پھر خود قیمے کے برتن میں سے کچھ قیمہ علیحدہ کرکے اس کے ساتھ کارروائی کرنے لگی۔ کچھ اشیا کے اضافے کے بعد جب اسے یقین ہوگیا کہ قیمہ مطلوبہ شکل میں آگیا ہے تو اس کے بعد اس نے چولہے پر توا رکھا اور آٹے کا پیڑ اپنا کر اسے بیلنے لگی بلی ہوئی روٹی پر گھی لگانے کے بعد اس نے اس میں قیمے کی فلنگ کی اور پھر اسے گرم توے پر ڈال دیا۔ یہی وہ وقت تھا جب مومو کچن میں داخل ہوگئی۔

''اف! کیا زبردست خوشبو آرہی ہے۔'' اپنی ناک سکیڑتے ہوئے مومو نے بے ساختہ ہی تبصرہ کیا تو کنول مسکرادی لیکن توجہ پراٹھے پر ہی رکھی۔ بہت توجہ سے تیار کیا گیا سنہری اور خستہ پراٹھا ایک پلیٹ میں رکھ کر وہ کچن سے باہر نکلی تو مومو اس کے ساتھ تھی۔ اس دوران ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کے دیگر لوازمات بھی سجائے جاچکے تھے۔

''میں تو بھئی آپ کے ہاتھ کا پراٹھا کھاؤں گی۔'' مومو نے ٹیبل پر موجود لوازمات پر ایک سرسری سے نگاہ ڈالنے کے بعد اعلان کیا اور پراٹھے والی پلیٹ اپنی جانب سرکالی۔

''آپ بھی لیجیے نا۔'' پراٹھے کا نوالہ توڑ کر منہ میں ڈالنے سے قبل اس نے کنول سے کہا۔

''میں لنچ لے چکی ہوں۔'' کنول نے بتایا۔

''پھر بھی تھوڑا سا میری خاطر میرا ساتھ دینے کے لیے لے لیں۔'' مومو نے اصرار کیا۔ کنول نے اس کے اصرار کو رد کرنا مناسب نہ سمجھا اور پلیٹ میں تھوڑا سا پلاؤ اور ایک شامی کباب نکال لیا۔

''واہ، زبردست۔ بڑے مزے کا پراٹھا بنایا ہے آپ نے مس کنول۔ آپ تو امتحان میں سو میں سے سو نمبر لے کر

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

برسا برس سے ہمارے ماہر طب خصوصاً ایسے مریضوں کے لیے جو اپنی نا سمجھی کی بنا پر [illegible]
جلا ہو کر طرح طرح کے علاج سے مایوس ہو گئے تھے ان کے لیے اپنے تجربہ، تحقیقات انتھک محنت [illegible]
کاوشوں سے ایسا نسخہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے کئی ناکارہ بوڑھوں کو بہت کم دنوں میں [illegible]
[illegible]
کار ہے آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کررہے ہیں کہ اس کے استعمال سے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

حکیم اینڈ سنز
پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

کامیاب ہوگئیں۔'' مومو نے پراٹھا کھاتے ہوئے ایک بار پھر تعریف سے بھرپور تبصرہ کیا۔

''تعریف کے لیے شکریہ۔ ویسے مجھے معلوم ہے یہ بہت زیادہ مزے کا نہیں ہوگا۔ مجھے بہت کم موقع ملتا ہے کچن میں جانے کا اس لیے میری کوکنگ کچھ خاص نہیں ہے یہ تو بس میں نے اس لیے بنادیا کہ میرا دل چاہ رہا تھا تمہیں اپنے ہاتھ سے کچھ بنا کر کھلانے کا۔'' کنول نے پوری سچائی سے بتایا۔

''آپ بہت سویٹ ہیں مس کنول! مجھے تو آپ بالکل کسی فیملی ممبر کی طرح لگتی ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو کنول باجی کہہ کر پکارلیا کروں؟'' مومو نے بہت محبت سے کہتے ہوئے کنول سے اجازت چاہی۔

''جو تمہارا دل چاہے کہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن یہ پراٹھا جلدی سے ختم کرو مجھے معلوم ہے کہ تم نے کل رات کے بعد سے کچھ نہیں کھایا اور اب تو سہ پہر بھی ختم ہونے کو ہے۔'' کنول نے فراخ دلی سے اجازت دیتے ہوئے اس کی توجہ کھانے کی طرف مبذول کروائی۔ مومو نے خاموشی سے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ البتہ پراٹھے کے علاوہ اس نے کنول کے اصرار پر بھی کسی اور شے کو چکھنے کی زحمت نہیں کی۔ کھانے کے بعد وہ دونوں ایک بار پھر اٹھ کر مومو کے کمرے میں آگئیں۔ ملازمہ مومو کی ہدایت پر چائے وہیں لے آئی۔ ''پتا ہے کنول باجی! میرا بڑا دل چاہتا تھا کہ مما کبھی مجھے اپنے ہاتھ سے کچھ بنا کر کھلائیں۔ آج آپ نے میرے لیے پراٹھا بنایا تو مجھے لگا میری برسوں کی خواہش پوری ہوگئی۔ کک کے ہاتھ سے بنے بے شمار کھانوں اور اچھے سے اچھے ریسٹورنٹ کی مہنگی ترین ڈشز میں مجھے کبھی وہ ذائقہ نہیں ملا جو آپ کے بنائے پراٹھے میں تھا۔ شاید ماں کے ہاتھ کا لمس اسی چیز کو کہتے ہیں جو عام سی شے کو بھی خاص بنادے۔'' مومو جو کہہ رہی تھی اسے سن کر کنول کے ہاتھ کپکپا گئے۔ اس کی حالت سے بے خبر مومو اپنی ہی کہہ رہی تھی۔

''میں مما کی محبت کو بہت ترسی ہوں۔ مجھے ہمیشہ ان سے یہ شکوہ بھی رہا ہے کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتیں لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ میں غلط تھی۔ مما نے ہمیشہ مجھ سے بہت محبت کی ہے لیکن بس انہیں اس محبت کا اظہار نہیں کرنا آیا اور اب جبکہ مما نے محبت کا اظہار کرنا سیکھ لیا ہے تو ان کے پاس مہلت نہیں رہی۔'' مومو کی آواز یکدم رندھ گئی۔

''تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو مومو! تمہاری مما ٹھیک ہوجائیں گی۔ تمہارے پاپا کوشش کرتو رہے ہیں۔'' کنول نے مومو کو دلاسہ دینا چاہا جس پر اس کے ہونٹوں پر محض ایک پھیکی سی مسکراہٹ ہی پھیل سکی۔ پھر وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''پاپا مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن ان کی محبت کے باوجود مجھے ہمیشہ ایک کمی کا احساس رہا۔ ممکن ہے میرے اس ننھیال اور ددھیال سے وابستہ رشتے ہوتے تو میں بہل جاتی لیکن یہ بھی میری بدقسمتی تھی کہ مائیگریشن کے وقت مما کی ساری فیملی ختم ہوگئی۔ پاپا نے انہیں سہارا دینے کے لیے ان سے شادی کی تو میرے ددھیال والے ان کی خود سے بڑی عمر کی عورت سے شادی کو قبول نہیں کرسکے۔''

مومو، کنول کو وہی کچھ بتارہی تھی جو خود اسے بتایا گیا تھا۔

''تو کیا تمہارا اپنے ددھیال والوں سے بالکل بھی ملنا جلنا نہیں؟'' کنول نے تجسس سے پوچھا کہ معظم کی فیملی کے بارے میں تو وہ بھی جاننا چاہتی تھی۔

''ایک دو دفعہ تقریبات کے موقع پر پاپا مجھے اپنے ساتھ لے کر وہاں گئے تھے لیکن کسی نے مجھے بہت زیادہ امپورٹینس نہیں دی پھر پاپا نے مجھے مری بھجوادیا تو میرے پاس کہیں آنے جانے کا ٹائم ہی نہیں رہا۔'' مومو نے سادگی سے بتایا۔

''اور وہ لوگ خود..... کیا وہ لوگ کبھی تمہارے گھر نہیں آئے؟'' کنول نے دریافت کیا۔

''دادی کا تو پاپا بتاتے ہیں ان کی شادی سے پہلے ہی انتقال ہوگیا تھا۔ دادا کی بھی دو سال پہلے ڈیتھ ہوگئی، دادا اپنی زندگی میں ایک بار آئے تھے لیکن مما کی ذہنی حالت کی وجہ سے خفا ہوکر دوبارہ نہیں آئے۔ وہ چاہتے تھے کہ پاپا، مما کو چھوڑ کر دوسری شادی کرلیں لیکن پاپا راضی نہیں ہوئے۔ پاپا خود جاتے تھے ان سے ملنے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ پاپا کے اپنے بہن بھائیوں کے پاس بھی فرصت نہیں کہ وہ ان سے رابطہ کریں یا پھر شاید ناراضی لاتعلقی کی شکل اختیار کرگئی ہے۔''

مومو نے بتایا تو کنول سر ہلا کر رہ گئی وہ اچھی طرح سمجھ سکتی تھی کہ فی زمانہ جو افراتفری کا عالم ہے وہاں رشتوں کی اہمیت دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے۔ خود اس نے اپنے ماموؤں کا رویہ دیکھا تھا۔ مومو کے ددھیال والے تو خیر کبھی قریب ہی نہیں رہے تھے کہ دلوں میں قربت و محبت پیدا ہوتی مگر اس کے دونوں ماموں تو طویل عرصہ ساتھ رہنے کے بعد بیگانے ہوگئے تھے۔ اپنے بال بچوں میں کھو کر انہیں اس بہن اور اس کے بچوں کا خیال نہیں رہا تھا جس کے آنگن میں ان کی

اپنی پرورش ہوئی تھی۔

''کل آپ کے ہاسپٹل سے جانے کے بعد میں مما کے ساتھ بہت دیر تک ان کے روم میں رہی مما نے کل پہلی بار مجھ سے بہت باتیں کیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ ان کے بعد کوئی ایسا ہو جو مجھے بالکل ان ہی جیسی محبت دے سکے۔ آپ جانتی ہیں کنول باجی انہوں نے اس سلسلے میں کس کا نام لیا؟'' مومو کے اس اچانک پوچھے گئے سوال پر کنول دم بخود سی بیٹھی رہ گئی حالانکہ اس سوال کا جواب وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ مومو اس کی طرف سے خاموشی پا کر خود ہی بتانے لگی۔

''انہوں نے مجھ سے آپ کا نام لیا۔ شروع میں ان کی بات سن کر مجھے بہت عجیب لگا لیکن پھر مما نے مجھے سمجھایا کہ آپ پاپا اور میرے لیے کتنی ضروری ہیں۔ خصوصاً پاپا کو آپ کی بہت ضرورت ہے۔''

''شاید اسی وجہ سے تم رات بھر جاگتی اور روتی رہی ہو؟'' مومو کی بات سن کر کنول شرمندگی سے بولی۔

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے مما کی بات بہت اچھی طرح سمجھ لی ہے اور ان ہی کی طرح میں بھی چاہتی ہوں کہ اتنا سیکریفائس (Sacrifice) کرنے کے بعد پاپا کو ان کی خوشی حاصل کرنے کا حق دیا جائے۔ میری اداسی کی اصل وجہ تو یہ ہے کہ میں مما کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔ ان کا انداز بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص کم سے کم وقت میں اپنے حصے کے سارے کام نمٹا لینا چاہتا ہو۔ ڈاکٹرز، پاپا، آپ یا میں کتنی ہی امید افزا بات کریں مما کے اپنے اندر امید کی کوئی کرن نہیں اور یہ بہت خطرناک بات ہے۔ بغیر امید کے آج تک میں نے کسی کو جیتے نہیں دیکھا۔'' اس بار مومو باوجود کوشش کے ضبط نہیں کر سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کنول دکھی دل سے اسے خود سے لگا کر چپ کروانے کی کوشش کرتی رہی لیکن اس کوشش کے دوران خود اس کی اپنی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہ رہے تھے۔ مومو کو لاکھ تسلیاں دینے کے باوجود خود اس کے اپنے احساسات بھی وہی تھے جن کا اظہار ابھی مومو نے کیا تھا۔

☆☆☆

''یہ کیسے ممکن ہے؟ میں ذہنی طور پر اس بات پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں یوں بھی برسوں ہمیں لندن کے لیے روانہ ہونا ہے ایسے میں اس طرح کا کوئی کام کیسے ممکن ہے؟'' معظم شاہ کے لہجے میں حیرت اور برہمی کی آمیزش تھی۔

''دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ یہاں پر وہ واقعہ وقوع پذیر ہو جاتا ہے جس کا انسان کو کبھی گمان بھی نہیں گزرتا۔ رہی ذہنی طور پر تیار نہ ہونے کی بات تو اس سے فرق نہیں پڑتا میں جس معظم شاہ کو جانتی ہوں اس نے اس سے بھی بڑے فیصلے بلا جھجک، بنا کسی مہلت کے مخالفتوں کے طوفان میں کیے ہیں۔'' حسینہ کا لہجہ معظم کے برعکس بہت پرسکون تھا۔

''تم سمجھنے کی کوشش کرو حسینہ! یہ صرف میرے اور تمہارے درمیان کا معاملہ نہیں۔ کنول اور اس کے اہل خانہ کی رضامندی، مومو کو ذہنی طور پر تیار کرنا یہ سب بچوں کا کھیل نہیں جو ایک دن میں ہو جائے۔ پھر دنیا کیا کہے گی کہ معظم شاہ اپنی شدید بیمار بیوی کے علاج کی فکر کرنے کے بجائے اس عمر میں خود سے آدھی سے بھی کم عمر لڑکی سے شادی کی فکر میں مبتلا ہے۔'' معظم نے اپنی آواز دھیمی رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا لہجہ بدستور جھنجلایا ہوا تھا۔

''کنول کی والدہ سے میں نے اجازت لے لی ہے اور مومو کو بھی ذہنی طور پر تیار کر دیا ہے۔ اسے آپ کی اور کنول کی شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔ باقی بچے دنیا والے تو ان کی زبانیں بند کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ میری خواہش ہے۔ پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ دنیا والوں میں اتنا قابل ذکر ہے ہی کون؟ میں تو سرے سے ہی تنہا ہوں اور آپ کے جو اپنے ہیں ان سے آپ کا رابطہ اتنا کم ہے کہ ان کے کسی اعتراض کی گنجائش نہیں نکلتی'' حسینہ نے گویا معظم کے ہر اعتراض کو ختم کر دیا۔

"پھر بھی ضروری نہیں کہ یہ سب اتنی عجلت میں ہو۔ لندن سے واپس آ کر بھی اس معاملے پر غور کیا جا سکتا ہے۔" معظم اب بھی پس و پیش سے کام لے رہا تھا۔

"کسے معلوم ہے کہ جب آپ لندن سے واپس لوٹیں تو میں آپ کے ساتھ ہوں بھی یا نہیں؟ میری جو حالت ہے اس سے آپ بھی واقف ہیں ایسی صورت میں کیا یہ بہتر نہیں کہ جو کام کل ہونا ہے وہ آج ہی ہو جائے۔ کم از کم مرنے سے پہلے میری آخری خواہش تو پوری ہو جائے گی۔ پلیز معظم! میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ میری بات رد نہ کریں، میں دنیا سے جاتے ہوئے یہ اطمینان اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتی ہوں کہ میری ذات سے آپ کو بھی کوئی فائدہ پہنچا۔ میں جو ساری زندگی آپ سے لیتی رہی جانے سے پہلے آپ کو کچھ دے سکی۔"

حسینہ نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ یہ سب کہتے ہوئے یکدم ہی معظم کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کی اس حرکت کے بعد معظم کو اپنے لیے کوئی جائے فرار دکھائی نہ دی اور اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ معظم کی ذرا سی ہامی بھرنے کی دیر تھی سب کام خودکار انداز میں ہونے لگے۔ معظم کو اندازہ ہوا کہ اس کی طرف سے اجازت ملنے سے قبل ہی حسینہ سارے انتظامات کر چکی تھی۔ معظم کے سامنے اس نے صرف چند فون کالز کی تھیں۔ وہ بہت خوش دکھائی دیتی تھی۔ ڈاکٹر سے خصوصی اجازت لے کر اس نے ہاسپٹل سے چند گھنٹے کی چھٹی بھی لے لی تھی۔ شام سات بجے جب معظم اپنے دو تین دوستوں اور مومو پر مشتمل مختصر برات کے ساتھ کنول کے گھر روانہ ہوا تو حسینہ نے خود اس برات کو رخصت کیا۔ وہ خود کمزوری کے باعث برات کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ معظم روانگی سے قبل ملازمین اور حسینہ کے ساتھ آئی نرس کو اس کے بارے میں سخت تاکید کر کے گیا تھا اس کے باوجود کنول کے گھر پہنچ کر نکاح کی کارروائی میں بہت عجلت سے کام لیا تھا۔ کنول کے گھر پر بھی زیادہ لوگ نہیں تھے۔ رشتے داروں میں اس کے ماموں ممانی ہی نمایاں نظر آ رہے تھے جو کچھ ناگواری کے ساتھ براتیوں کی خاطر مدارت کرتے رہے تھے۔ نکاح کے فوراً بعد رخصتی عمل میں آ گئی تھی۔ اس وقت معظم نے کنول اور اس کی والدہ کو دیکھا تھا۔ کنول بھاری جوڑے اور زیورات سے لدی پھندی بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ یقیناً یہ سارا انتظام حسینہ نے کیا تھا۔ کنول کی والدہ کا لباس البتہ سادہ اور ہلکے رنگ کا تھا جس پر انہوں نے بڑی سی چادر اس انداز میں اوڑھ رکھی تھی کہ معظم کو ان کا چہرہ مکمل طور پر دکھائی نہیں دیا تھا۔

"آپ سے کنول کا نکاح میں نے اس بنیاد پر کیا ہے کہ اس رشتے کے ساتھ بہت سے لوگوں کی خوشیاں جڑی ہوئی ہیں۔ میں اس یقین کے ساتھ اپنی بچی کو آپ کے ساتھ رخصت کر رہی ہوں کہ یہ آپ کو بہت خوش رکھے گی۔ آپ سے میں بس اتنی امید کرتی ہوں کہ جیسے اس رشتے کو جوڑتے وقت میں نے دنیا کی پروا نہیں کی آپ بھی دنیا داری کو بھول کر اس رشتے کو نبھائیں گے۔" کنول کے معظم کے ساتھ گھر کی دہلیز عبور کرنے سے قبل اس کی والدہ نے دھیمے لہجے میں معظم سے یہ چند جملے کہے تھے۔

"آپ فکر نہ کریں، میں کنول کا ہر ممکن خیال رکھوں گا۔" جواباً معظم نے انہیں یقین دہانی کروائی وہ سمجھ سکتا تھا کہ اپنی بچی کی اس غیر معمولی انداز میں شادی کرنے پر اس عورت کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ یہ حسینہ ہی کا کارنامہ تھا جو اس نے کنول کی والدہ کو راضی کر لیا تھا کس طرح اس بارے میں معظم قیاس آرائی ہی کر سکتا تھا اور کنول کے گھریلو حالات کو دیکھتے ہوئے زیادہ امکان اس بات کا ہی تھا کہ حسینہ نے اس شادی کے بدلے اس کے خاندان کی مالی معاونت کی ہو۔ اگر ایسا تھا بھی تو معظم کو اعتراض نہیں تھا۔

کنول کے گھر سے وہ لوگ اس انداز میں رخصت ہوئے کہ گاڑی کی پچھلی نشست پر کنول، معظم اور مومو کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ مومو اپنی حرکات و سکنات اور گفتگو سے خوش نظر آ رہی تھی۔ معظم کو اس کی بہت فکر تھی۔ حسینہ کی طرف سے یقین دہانی کے باوجود اس نے نکاح سے پہلے خود بھی مومو سے بات کی تھی اور اس نے بہت باوقار انداز میں معظم کو بتایا تھا کہ اسے اس نکاح پر کوئی اعتراض نہیں۔ مومو کا وہ انداز دیکھ کر معظم کو شدت سے احساس ہوا تھا کہ حالات نے اس کی بچی کو وقت سے بہت پہلے سمجھدار بنا دیا ہے۔

"بڑی بیگم صاحبہ نے حکم دیا تھا کہ دلہن گھر آئے تو آپ کو اور دلہن کو آپ کے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔ کمرا انہوں نے تیار کروا دیا ہے۔" دس بجے کے کچھ بعد وہ لوگ گھر پہنچے تو ملازموں نے پھولوں کی برسات کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور پھر ایک ملازم نے معظم کو یہ اطلاع دی۔

"وہ خود کہاں ہیں؟" خلافِ توقع حسینہ کو اپنے انتظار میں نہ پا کر معظم نے بے چینی سے ملازم سے پوچھا۔ معظم کے دوست راستے سے ہی رخصت ہو گئے تھے۔

"جی وہ کہہ رہی تھیں کہ تھک گئی ہیں اس لیے آرام کریں گی۔" ملازم نے اطلاع دی تو معظم نے ناچار کنول

کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے اسے احساس تھا کہ بھاری لباس اور زیورات کے ساتھ کنول کو یہاں کھڑے رہنا مشکل ہو رہا ہوگا۔ کمرے میں پہنچ کر معظم اور کنول کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ کمرا بے تحاشا پھولوں کے ساتھ بے حد خوبصورتی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ یقیناً یہ کام حسینہ نے برات کی روانگی کے بعد اس طرح کے کام انجام دینے والے کسی ادارے سے کروایا تھا۔ کمرے کی مہکتی فضا میں کھڑے ہو کر معظم نے پہلی بار اپنے دل میں اس عورت کے لیے شدت سے محبت محسوس کی جسے۔۔۔ اس نے بیس اکیس سال قبل محض ایک اخلاقی فریضے کے طور پر اپنایا تھا۔

''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔'' عجیب و غریب کیفیت میں گھرے معظم کو کنول کی آواز نے چونکایا وہ سوالیہ نظروں سے کنول کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں چاہتی ہوں کہ آپ کی اور میڈم کی لندن روانگی سے قبل یہ جو دو راتیں باقی ہیں یہ میں میڈم کے ساتھ، ان کی خدمت کرتے ہوئے گزار دوں۔'' کنول نے جھجکتے ہوئے انداز میں جو فرمائش کی تھی اسے سن کر معظم دم بہ خود رہ گیا۔ اس کی زندگی میں دو عورتیں آئی تھیں اور دونوں ہی عجیب و غریب تھیں۔ ان دونوں کے درمیان جو نازک رشتہ تھا اس کے ساتھ لازم ملزوم سمجھے جانے والے روایتی رقیبانہ رویے کے برخلاف معظم انہیں محبت کی ڈور میں بندھا ہوا محسوس کرتا تھا۔ اس وقت بھی کنول کی بات سن کر اس کے دل میں کنول کی قدر و منزلت بڑھ گئی تھی۔ معظم کے ساتھ کی بہت شدت سے متمنی ہونے کے باوجود کنول نے اس مقام پر بے صبری سے کام نہیں لیا تھا اور نہ ہی معظم پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے برعکس وہ معظم کی بیمار بیوی کی خدمت کرنے کی خواہشمند تھی جبکہ اسے معلوم تھا کہ یہی دو راتیں ہیں جو شادی شدہ زندگی کا آغاز ہونے کے بعد اسے فوری طور پر معظم سے مل سکتی ہیں۔ اس کے بعد تو معظم، حسینہ کو لے کر ایک طویل مدت کے لیے لندن روانہ ہو جاتا۔ اپنی گداز ہوتی قلبی کیفیات کے ساتھ معظم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کنول کو اپنی رضامندی کا عندیہ دیا اور خود بیڈ کے ایک کونے پر ٹک گیا۔ کنول اس کی طرف سے اجازت ملنے پر واڈروب سے ایک سادہ سوٹ نکال کر ملحقہ غسلخانے میں چلی گئی۔ کنول کے سائز کی مناسبت سے واڈروب میں لباس کی فراہمی کا انتظام بھی یقیناً حسینہ کے حکم پر کیا گیا تھا۔ مختصر وقت میں بھی اس نے چھوٹی سے چھوٹی بات کا دھیان رکھا تھا۔ کنول پانچ منٹ بعد ہی غسل خانے سے نکل آئی۔ زیورات اور بھاری دوپٹا وہ اندر جانے سے پہلے ہی اتار چکی تھی۔ غسل خانے میں اس نے محض لباس کی تبدیلی اور منہ دھو کر میک اپ سے نجات کے کام سرانجام دیے تھے۔ منہ دھو لینے کے باوجود میک اپ کے بچے کھچے اثرات اور چہرے کی مخصوص دمک اس بات کی چغلی کھا رہی تھی کہ وہ نئی دلہن ہے۔ ''میں میڈم کے کمرے میں جا رہی ہوں۔'' سلیقے سے دوپٹا اوڑھتے ہوئے کنول نے معظم کو اطلاع دی اور کمرے کے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔'' معظم بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ کمرے سے نکلتے ہی ان کا سامنا مومو سے ہوا۔ وہ سفید چہرے کے ساتھ اس کمرے کے دروازے پر جہاں ملازم کے مطابق حسینہ آرام کر رہی تھی، کھڑی ہوئی تھی۔

''کیا بات ہے مومو؟'' معظم اس کی حالت دیکھ کر ٹھٹکا۔

''مما گھر پر نہیں ہیں پاپا۔'' مومو، معظم کو سامنے پا کر ہلکتی ہوئی اس سے آ چمٹی۔

''کیا مطلب؟ کہاں گئی وہ؟'' معظم بوکھلایا۔

''بیگم صاحبہ ہاسپٹل میں ہیں صاحب۔ ایک گھنٹے پہلے ان کی طبیعت کافی بگڑ گئی تھی۔ نرس ہاسپٹل سے ایمبولینس منگوا کر انہیں اپنے ساتھ ہاسپٹل لے گئی۔ جانے سے پہلے انہوں نے سختی سے ہمیں حکم دیا تھا کہ آپ کو ان کے ہاسپٹل جانے کے بارے میں نہ بتایا جائے۔'' مومو کے بجائے جواب ایک ملازم نے دیا وہ پہلے بھی شاید یہیں کھڑا تھا لیکن معظم کی اس پر نظر نہیں پڑی تھی۔

''ہم ہاسپٹل چلتے ہیں۔'' کنول نے معظم کے ملازم پر غصہ نکالنے سے قبل تیزی سے تجویز پیش کی اور خود مومو کو اپنے بازو کے حصار میں لے کر پیار سے تسلیاں دیتے ہوئے گھر کے بیرونی راستے کی طرف بڑھنے لگی۔ معظم نے بھی خود پر قابو پاتے ہوئے پیش قدمی کی۔ وہ بہت طوفانی رفتار سے گاڑی چلاتا ہوا ہاسپٹل پہنچا تھا۔

''اس وقت وہ بہتر ہیں لیکن ہم آپ کو بہت زیادہ امید نہیں دلا سکتے۔'' ہاسپٹل پہنچ کر ڈاکٹر سے استفسار کرنے پر معظم کو یہ جواب ملا تھا۔ معظم کی خواہش پر دو گھنٹے بعد ڈاکٹر نے اسے آئی سی یو میں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ آئی سی یو میں حسینہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی دکھائی دی تھی۔ اس کے چہرے پر آکسیجن ماسک بھی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن تکلیف کی جو کیفیت اس کے چہرے پر ثبت ہو گئی تھی اس سے ظاہر تھا

کہ وہ موت وزیست کی شدید کشمکش سے گزری ہے۔ مصنوعی تنفس کے ذریعے اس کی سانسیں بحال کرنے کی اطلاع تو خود ڈاکٹر نے بھی اسے دی تھی۔ معظم دکھی دل کے ساتھ حسینہ کے بے رونق چہرے کو دیکھ کر آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ کرسکا۔ اسے آئی سی یو میں بھی زیادہ دیر ٹھہرنے کی اجازت نہیں ملی۔ وہ ساری رات اس نے، کنول اور مومو نے آنکھوں میں کاٹی۔ بہت اصرار کے بعد ڈاکٹرز کی طرف سے کنول اور مومو کو بھی محض اتنی دیر کے لیے کہ وہ حسینہ پر ایک نظر ڈال سکیں، آئی سی یو میں جانے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس بلاخیز رات کی صبح اس انداز میں ہوئی تھی کہ ڈاکٹر نے حسینہ کی خواہش پر ان تینوں کو اس سے ملنے کی اجازت عطا کردی۔

''تم تینوں کو ایک ساتھ دیکھ کر میرا دل کتنی خوشی اور اطمینان محسوس کررہا ہے، یہ میں لفظوں میں نہیں بتا سکتی۔'' حسینہ نے ایک دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان تینوں کا استقبال کرتے ہوئے یہ جملہ ادا کیا۔

''لیکن ہماری خوشی اس وقت مکمل ہوگی جب آپ اس بیڈ سے اٹھ کر ہمارے ساتھ گھر چلیں گی۔'' کنول نے حسینہ کا ہاتھ تھام کر محبت سے کہتے ہوئے سب کے جذبوں کی ترجمانی کی۔

''میرے پاس اب مہلت ہی کہاں رہی ہے؟ یوں بھی انسان کی ہر خواہش تو پوری نہیں ہو پاتی بہت کچھ پانے کے بعد بھی وہ تشنہ رہ جاتا ہے اور اس تشنگی کو قبول کرلینا ہی رب کی رضا میں راضی ہوجانا ہے۔ میں نے بہت دیر میں یہ بات سمجھی لیکن امید ہے کہ تم میں سے کوئی یہ غلطی نہیں کرے گا۔'' کنول کی بات کے جواب میں یہ بات کہتے ہوئے حسینہ کے ذہن میں اس کی پوری زندگی کا نقشہ تھا۔ اسے یاد تھا کہ کیسے بے سروسامانی میں معظم کا ساتھ مل جانے پر اس نے ناشکری کرتے ہوئے اولاد سے بچھڑنے کے غم کو اس بری طرح خود پر سوار کیا تھا کہ نہ کبھی خوش رہی تھی اور نہ ہی معظم کو خوش رکھ سکی تھی۔ حالانکہ اللہ نے تلافی کے طور پر اسے مومو سی پیاری بیٹی بھی عطا کردی تھی۔ اس بات کو حسینہ نے اب جاکر سمجھا تھا اور یہ سمجھ مل جانے کے بعد اس میں صبر کی وہ صفت پیدا ہوئی تھی جس نے اسے دینے پر اکسایا تھا۔ وہ معظم کی زندگی میں خوشی کا دیپ جلانے کے بعد اتنی سیراب ہوگئی تھی کہ اپنے بیٹوں کا پتا ٹھکانا جان لینے کے باوجود ان سے وقتِ آخر نہ ملنے کی تشنگی قبول کرلی تھی۔ اسے یقین ہوچلا تھا کہ جن چیزوں پر اس نے اس دنیا میں صبر کرلیا ہے وہ اللہ آخرت میں اسے ضرور عطا کردے گا۔

☆☆☆

''سر! ایک خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ کنول صاحبہ کی والدہ ہیں۔''

انٹرکام پر ملنے والی اس اطلاع نے معظم کو حیرت میں مبتلا کردیا۔ آج حسینہ کی موت کے بعد چوتھا دن تھا اور وہ پہلی بار فیکٹری آیا تھا۔ حسینہ اس دن ہاسپٹل میں ان تینوں سے مشترکہ ملاقات کے دو گھنٹے بعد ہی مرگئی تھی۔ اسے علاج کے لیے لندن لے جانے کی نوبت ہی نہیں آسکی تھی۔ غم کے ان لمحات میں کنول نے بھرپور ساتھ دیا تھا۔ خصوصاً مومو کو سنبھالنے اور حوصلہ دینے میں اس کا کلیدی کردار رہا تھا۔ کنول کی والدہ اور بہن بھائی بھی تین دن تک مسلسل معظم کے گھر آتے رہے تھے۔ ان تین دنوں میں معظم کا وقت زیادہ تر مردانے میں گزرا تھا اس لیے اس کا کنول کی والدہ سے سامنا نہ ہوسکا تھا کچھ وہ خود بھی گریز پا نظر آتی تھیں۔ ایسے میں ان کی یہاں فیکٹری میں معظم سے ملاقات کے لیے آمد معظم کے لیے اچنبھے کا باعث تھی۔ حیران سا معظم ان کی آمد کے مقصد کے بارے میں کوئی اندازہ لگانے کی کوشش ہی کررہا تھا کہ وہ ایک آدمی کی رہنمائی میں وہاں چلی آئیں۔

''السلام علیکم۔ آئیں تشریف رکھیں۔'' معظم نے اپنے رتبے کے اعتبار سے کھڑے ہوکر ان کا استقبال کرتے ہوئے احترام سے کہا۔ وہ دھیمی آواز میں معظم کے سلام کا جواب دے کر ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ آج بھی انہوں نے خود کو اسی طرح چادر میں چھپا رکھا تھا جیسے پہلی بار معظم نے اپنے اور کنول کے نکاح والے دن انہیں دیکھا تھا۔

''فرمایئے آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیسے کی؟ اگر کوئی مسئلہ تھا تو گھر پر بھی بات ہوسکتی تھی یا اگر آپ میرے گھر پر بات نہیں کرنا چاہتی تھیں تو مجھ سے کہتیں میں خود آپ کے گھر آجاتا۔'' انٹرکام پر ڈسٹرب نہ کرنے کا آرڈر دینے کے بعد معظم ان سے مخاطب ہوا۔

''مجھے اندازہ ہے کہ میرا یوں یہاں آنا آپ کے لیے حیرت کا باعث ہے لیکن معاملہ اس نوعیت کا تھا کہ مجھے گفتگو کے لیے آپ کا اور اپنا، دونوں کا گھر نامناسب معلوم ہوا۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے اور آپ کے درمیان جو گفتگو ہو اس سے ہم دونوں کے سوا کوئی واقف نہ ہوسکے۔'' معظم کی بات کے جواب میں کنول کی والدہ نے بے حد رسان سے وضاحت کی۔

''آخر ایسی کیا بات ہے؟'' معظم ان کی بات سن کر

اپنی حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

''بات بہت اہم ہے۔ حسینہ صاحبہ اپنے انتقال سے پہلے ایک ذمے داری مجھے سونپ کر گئی تھیں۔ ان کی وصیت پر عمل کرنے کے لیے ہی آج میں یہاں آئی ہوں۔'' کنول کی والدہ کی بات سن کر معظم کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اسے یاد آیا کہ کنول سے نکاح سے پہلے بھی اسے یہ خیال آیا تھا کہ حسینہ نے کنول کی والدہ کو اس نکاح پر راضی کرنے کے لیے کسی طرح کی مالی امداد کا وعدہ کیا ہوگا۔ آج شاید وہ، اسی وعدے کی یاددہانی کے لیے یہاں آئی تھیں۔ اس خیال کے آتے ہی معظم اپنا گلا کھنکارتے ہوئے بولا۔

''آپ کے اور حسینہ کے درمیان کس طرح معاملات طے پاتے تھے یہ تو میں نہیں جانتا لیکن حسینہ نے آپ سے جو بھی وعدہ کیا تھا میں اسے پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''آپ نے شاید میری بات غور سے نہیں سنی۔ میں نے آپ کی بیگم کے کسی وعدے کا نہیں بلکہ ان کی سونپی ہوئی ذمے داری کا ذکر کیا ہے۔'' کنول کی والدہ نے معظم کو ٹوکا۔

''کیسی ذمے داری؟'' معظم الجھا۔

''کچھ حقائق آپ کے سامنے لانے کی ذمے داری۔ کنول سے آپ کا نکاح کرتے وقت ہم لوگوں نے آپ سے چند حقائق چھپائے تھے کیونکہ ہمیں اندازہ تھا کہ اگر آپ کے علم میں کنول کی اصلیت آگئی تو آپ اس نکاح کے لیے راضی نہ ہوں گے۔'' کنول کی والدہ کی بات نے معظم کو کچھ اور الجھن میں ڈال دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کنول کی اصلیت کیا ہے؟ اور کیا یہ اصلیت اتنی خطرناک ہے کہ واقعی معظم اس نکاح پر راضی نہ ہوتا؟ کیا کنول کا تعلق کسی ایسے ویسے گھرانے سے ہے؟ وہ کسی کے گناہ کی یادگار ہے یا پھر خود ہی بدکردار اور کرپٹ لڑکی ہے۔ آخری بات پر تو معظم خود بھی یقین نہیں رکھتا تھا۔ باقی اگر کوئی مسئلہ تھا اسے جاننے میں اسے دلچسپی نہیں تھی اسے کنول سے محبت تھی اور اس محبت میں وہ اس کی ذات سے جڑے کسی کمزور پہلو کو بہ آسانی نظرانداز کرسکتا تھا۔ اپنی اسی سوچ کے ساتھ وہ کنول کی والدہ سے بولا ''کنول کا ماضی کیا تھا مجھے اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے وہ جو ہے، جیسی ہے ہر حالت میں قبول ہے۔''

''مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کنول سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ اسے ہر عیب کے ساتھ قبول کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن میری بات کا یہ مقصد نہیں تھا کہ کنول میں خدانخواستہ کوئی عیب ہے۔ میری بیٹی الحمدللہ بے حد معصوم اور باکردار ہے۔ میں اس کی اصلیت کے حوالے سے آپ کو جو حقیقت بتانا چاہتی ہوں اس کا تعلق براہِ راست کنول سے نہیں بلکہ میرے، آپ کے اور حسینہ صاحبہ کے ماضی سے ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو وقتی طور پر بے شک آپ سے چھپالی گئی لیکن ہمیشہ اس بات کا چھپا رہنا ممکن نہیں اسی لیے آج میں خود سے آپ کو سب کچھ بتانے یہاں آگئی ہوں۔'' کنول کی والدہ نے معظم سے یہ بات کہتے ہوئے اچانک ہی اپنے چہرے سے چادر ہٹادی۔ چادر کے پیچھے سے ظاہر ہونے والے چہرے کو معظم پہلی نظر میں شناخت نہیں کرسکا۔ حالات کی سختیوں سے گہنا جانے والے اس چہرے پر بیس اکیس سال پہلے کی ناجیہ کا چہرہ کھوج لینا آسان نہیں تھا۔ معظم کو پہچان کے مراحل طے کرنے میں کچھ وقت لگا اور جب وہ یہ مرحلہ طے کرچکا تو بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کے ساتھ ''ناجیہ'' کا لفظ بھی ادا کیا۔

''بیٹھ جائیے معظم صاحب! میں جانتی ہوں کہ اس وقت آپ بہت بڑے صدمے سے دوچار ہوئے ہیں لیکن زندگی ان تلخ حقائق کا ہی نام ہے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ یہ سب نہ ہونے دوں لیکن ایک مرتے ہوئے انسان کی آخری خواہش اور اپنی بیٹی کی خوشیوں کی خاطر ہار مان لی۔ حسینہ صاحبہ جنہیں میں بھی ماں کہہ کر پکارتی تھی میری وہ محسنہ ہیں جو اگر مجھ سے میری جان بھی مانگتیں تو میرے لیے انکار ممکن نہیں ہوتا۔ یہاں تو میری بیٹی کی خوشیوں کا بھی سوال تھا۔ کنول نے اپنی زبان سے کبھی مجھے آپ کے بارے میں نہیں بتایا لیکن میں ماں ہوکر اس کے اندر آنے والی تبدیلیوں سے کیسے ناواقف رہتی؟ میں نے بہت پہلے جان لیا تھا کہ وہ آپ کی محبت میں مبتلا ہوگئی ہے۔ اپنی دو عزیز ہستیوں کی خاطر میں اس نکاح کے لیے تیار ہوگئی۔ اس کے لیے مجھے کتنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا یہ داستان الگ ہے لیکن بہرحال میں کسی نہ کسی طرح اظہر کو اس نکاح میں ولی کی حیثیت سے شامل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اظہر کی مخالفت کا سبب آپ کی اور کنول کی عمروں کے درمیان موجود فرق تھا باقی حقائق تو اسے بھی نہیں معلوم۔ بیچارا ساری زندگی آپ سے نفرت کرنے کے باوجود آپ کو پہچانتا تک نہیں ہے۔ بیس سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد ایک سات سالہ بچہ اس لائق نہیں ہوتا کہ بچپن میں دیکھی جانے والی شکل کو اتنے طویل عرصے بعد شناخت کرسکے۔ یہی معاملہ آپ کے ساتھ بھی ہوا۔ آپ بھی اظہر کو نہیں پہچان سکے۔ ہم لوگوں کو تو پہلے ہی اس بات کا یقین تھا یوں بنا کسی رکاوٹ کے آپ کا اور کنول کا نکاح بخیر و خوبی

انجام پا گیا۔'' ناجیہ بہت سکون سے کوئی داستان سنانے کے انداز میں معظم کو حقائق سے آگاہ کر رہی تھی۔

''اتنا بڑا دھوکا۔ تم لوگوں نے مجھے کاٹھ کا پتلا سمجھا تھا جو میرے ساتھ یہ سب کر گزرے؟ اف خدا؟ میں کیسے ان تلخ حقائق کو قبول کروں؟ تم لوگوں کو ذرا خیال نہیں آیا کہ رشتوں کا یہ گورکھ دھندا کتنا نازک ہے؟ میں نے حسینہ کے ساتھ بیس سال ازدواجی زندگی گزاری ہے اور تم لوگوں نے کنول کو میری بیوی بنا دیا یہ سوچے بغیر کہ کنول اور حسینہ کا آپس میں کیا رشتہ بنتا ہے؟''

معظم چیخ پڑا تھا۔

''ان دونوں کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں بنتا۔ حسینہ صاحبہ میری سوتیلی ماں تھیں اور یہ رشتہ ابا کے انہیں طلاق دینے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا۔ شرعاً ان کا اور کنول کا ایسا کوئی تعلق نہیں بنتا کہ ان دونوں کے آپ کے نکاح میں آنے میں کوئی قباحت ہو۔ اخلاقی طور پر پابندی عائد ہو سکتی تھی لیکن اس صورت میں کہ اس کہانی کا ہر کردار ابتدا سے سب کچھ جانتا ہوتا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس حیثیت میں ایک دوسرے سے نہیں ملا کہ خود کو کسی رشتے سے بندھا محسوس کرتا۔ خود آپ جب کنول سے ملے اور اس کی محبت میں مبتلا ہوئے تو کیا آپ کو خبر تھی کہ وہ کون ہے؟ کنول تو اب بھی کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی میں چاہتی ہوں کہ اسے معلوم ہو۔ زندگی میں ہر سچ بولنا ضروری نہیں ہوتا خصوصاً ایسا سچ جو زندگی کو آسان بنانے کے بجائے مشکل تر بنا دے۔''

ناجیہ، معظم کے ردِعمل کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی اس لیے بہت پُرسکون انداز میں اس سے گفتگو کر رہی تھی۔

''خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔ میرا ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔ اس وقت میں کچھ بھی سننے اور سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔'' معظم شاہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے چلایا۔

''ٹھیک ہے، میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔ ویسے بھی اب مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا۔ فیصلے کا اختیار آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بس اتنی درخواست ضرور کروں گی کہ ماضی کے ہر حوالے کو بھول کر اپنے حال کی بہتری دیکھیں۔ آپ کو اس مشکل صورتحال سے دوچار کرتے ہوئے ہم دونوں خواتین نے بھی یہی کیا تھا۔ اگر آپ ماضی کو فراموش کر دیں تو آپ، کنول اور مومو بہت خوبصورت زندگی گزار سکتے ہیں۔ ویسی زندگی جو ایک مرتی ہوئی عورت نے آپ کو دینی چاہی تھی۔''

ناجیہ نے اپنے سابقہ پُرسکون انداز میں معظم سے یہ چند جملے کہے اور چادر کو پہلے ہی کی طرح اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتی ہوئی معظم کے آفس سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

''آپ نے گھر واپس آنے میں بہت دیر کر دی۔ فون بھی نہیں کیا۔ میں نے فیکٹری سے معلوم کیا تو پتا چلا وہاں سے آپ دوپہر کو ہی نکل گئے تھے۔ میں سارا وقت پریشان ہوتی رہی۔ آپ کا موبائل بھی بند جا رہا تھا۔ کہاں چلے گئے تھے آپ؟'' معظم کو ناجیہ کے کیے گئے انکشافات نے ذہنی طور پر بہت الجھا دیا تھا۔ اسی الجھن کے زیرِ اثر وہ سارا وقت اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا تھا۔ گھر واپس آنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی لیکن پھر گہری ہوتی رات نے اسے احساس دلایا کہ کنول اور مومو اس کے لیے پریشان ہو رہی ہوں گی ناچار وہ واپس گھر لوٹ آیا۔ گھر پہنچتے ہی اس کا کنول سے سامنا ہوا۔ وہ اس کی منتظر تھی اور حسبِ توقع پریشان ہو رہی تھی۔

''مومو کہاں ہے؟'' کنول کو دیکھ کر معظم کے احساسات عجیب سے ہو گئے تھے چنانچہ اس کے کسی سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے خشک سے انداز میں مومو کے بارے میں پوچھا۔

''مومو اپنے کمرے میں ہے۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میری آپ سے بات ہو گئی ہے اور آپ نے گھر دیر سے واپس آنے کو کہا ہے اس لیے وہ مطمئن ہے۔'' کنول نے بتایا تو معظم سر ہلاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے انداز میں موجود بے گانگی اور اضطراب کو محسوس کرتی ہوئی کنول بھی اس کے پیچھے تھی۔

''کھانا لگواؤں آپ کے لیے؟'' وارڈروب کھول کر کھڑے معظم سے اس نے دریافت کیا۔

''نہیں۔'' یک لفظی جواب دے کر معظم نے ہینگر میں لٹکا اپنا ایک آرام دہ شلوار قمیص نکالا اور وارڈروب بند کر دیا۔

''اچھا آپ فریش ہو جائیں۔ میں آپ کے لیے دودھ لے کر آتی ہوں۔'' کنول نے اس کے اجنبی انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''تھینکس۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ تم بس مومو کا خیال رکھو ابھی وہ صدمے میں ہے اس لیے اسے زیادہ دیر تنہا چھوڑنا مناسب نہیں۔'' معظم کی بات سے ظاہر تھا کہ وہ کنول کو زیادہ دیر اپنے بیڈروم میں دیکھنا نہیں چاہتا۔ کنول نے اس کا اشارہ سمجھ لیا اور ''جی اچھا'' کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد معظم نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ہینگر ایک طرف ڈالا اور خود سر پکڑ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ یہ لڑکی جس سے اس نے اس وقت اتنی بے رخی برتی تھی اسے کبھی

عزیز تھی یہ وہ خود ہی بہتر جانتا تھا۔ اسے دیکھ کر برسوں بعد اس نے اپنے اندر زندگی کی امنگ محسوس کی تھی۔ اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ اپنے لیے بھی کچھ خواب دیکھے لیکن اب جو تلخ حقیقت سامنے آئی تھی اس نے سارے خوابوں کو یکدم مسمار کر دیا تھا۔ کنول کا ناجیہ کی بیٹی ہونا اور ناجیہ کے حوالے سے حسینہ سے بننے والا رشتہ اسے بری طرح الجھا رہا تھا۔ اس لڑکی کو جس کی سگی ماں کو کبھی وہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا رہا تھا اپنی شریکِ حیات کی حیثیت سے قبول کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ کنول اس کے نکاح میں آچکی تھی اور شرعی و قانونی حیثیت سے اس کی بیوی تھی۔

''کیا مجھے کنول کو اس بندھن سے آزاد کر دینا چاہیے؟ یوں بھی ابھی یہ رشتہ صرف کاغذی حیثیت رکھتا ہے۔''

پریشان معظم کے ذہن میں یہ سوچ ابھری تو وہ مضطرب ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس رشتے کو ختم کر دینا اتنا آسان نہیں کیونکہ اس رشتے کو ختم کر دینے کی صورت میں صرف وہی تکلیف نہ اٹھاتا کنول بھی متاثر ہوتی۔ وہ جانتا تھا کہ کنول بھی اسے اتنی ہی شدت سے چاہتی ہے جتنا کہ وہ خود اسے چاہتا تھا۔ پھر وہ تو ایسی کسی حقیقت سے بھی واقف نہیں تھی جس نے معظم کا قرار چھین لیا تھا۔ ناجیہ نے بھی اسے یہی نصیحت کی تھی کہ کنول کو اس بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔ ناجیہ کا خیال آنے پر معظم نے اس کے اور اپنے درمیان ماضی میں پائی جانے والی جذباتی وابستگی کے بارے میں سوچا۔ آج دل میں اس وابستگی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اس پر انکشاف ہوا کہ دراصل وہ جذباتی وابستگی محبت تھی ہی نہیں۔ وہ تو بس نوجوانی کے دنوں میں جذبات کے دریا میں ایک معمولی سے کنکر کے گرنے سے پیدا ہونے والا ارتعاش تھا جو بہت جلد ختم بھی ہو گیا۔ اگر ناجیہ کے لیے اس کے جذبات میں گہرائی ہوتی تو وہ اپنی تمام تر ہمدردی کے باوجود کبھی حسینہ کو اپنی بیوی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی حیثیت سے قبول نہ کر پاتا۔ ناجیہ اتنے برسوں میں اسے یاد رہی تو صرف حسینہ کی وجہ سے۔ اگر حسینہ کے بجائے اس کی شادی کسی اور عورت سے ہوتی تو وہ ناجیہ کو یکسر فراموش کر دیتا جیسا کہ کنول کے اس کی زندگی میں آنے کے بعد ہوا تھا۔ کنول کے لیے اس نے اپنے دل میں اتنی شدت محسوس کی تھی کہ اسے یاد بھی نہیں رہا تھا کہ اس نے ناجیہ نامی کسی لڑکی کی کبھی تمنا بھی کی تھی۔ دراصل وہ جان گیا تھا کہ کسی لڑکی میں محسوس ہونے والی وقتی دلچسپی اور محبت میں کیا فرق تھا۔ کنول کی محبت اس کے روم روم میں بسی تھی لیکن اب یہ محبت بہت بڑے امتحان سے دوچار ہوگئی تھی۔ کنول سے دستبرداری ناممکن نظر آتی تھی تو اسے قبول کرنے کی راہ میں بھی حسینہ اور ناجیہ نامی عورتیں رکاوٹ بنی کھڑی تھیں لیکن کمال یہ تھا کہ رکاوٹ نظر آنے والی ان دو عورتوں نے ہی بھرپور کوشش کر کے کنول کو اس کی زندگی میں داخل کیا تھا اب اس کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ کنول کو قبول کرے یا ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے بے دخل کر دے۔

☆☆☆

''پاپا آ گئے؟'' کنول، مومو کے کمرے میں پہنچی تو اس نے مندی مندی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں آ گئے ہیں۔ تمہارا پوچھ رہے تھے میں نے بتا دیا کہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہے۔'' کنول نے تکیہ ٹھیک کر کے اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بتایا۔

''ٹھیک ہے میں صبح ان سے مل لوں گی ابھی تو وہ تھکے ہوئے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ کو بھی اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنا چاہیے۔'' مومو نے اسے مشورہ دیا۔

''میں یہاں ٹھیک ہوں۔ جب تک تم بورڈنگ نہیں چلی جاتیں میں تمہارے ساتھ تمہارے کمرے میں ہی رہوں گی۔'' کنول نے اسے جواب دیا۔

''یہ پاپا نے آپ سے کہا ہے؟'' مومو نے کنول کی بجھی ہوئی صورت دیکھ کر پوچھا، اب وہ مکمل طور پر نیند کے خمار سے باہر محسوس ہو رہی تھی۔

''وہ کیوں کہیں گے؟ میرا اپنا دل چاہ رہا ہے۔'' کنول نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ میری فکر مت کریں کنول باجی! اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے مما کی ڈیتھ کو ایکسیپٹ کر لیا ہے۔ ویسے بھی انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کے بعد اداس نہ ہوں کیونکہ وہ آپ کو میری کیئر کرنے کے لیے میرے پاس چھوڑ کر جا رہی ہیں۔'' کنول کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے مومو نے اس سے کہا تو وہ مسکرا دی اور پھر بات بدلنے کے انداز میں بولی۔

''تو تم مجھے اپنی کیئر کرنے دو نا۔ خواہ مخواہ کیوں مجھے اپنے کمرے سے بھگانے پر تلی ہو؟''

''میں کیوں بھگاؤں گی؟ مجھے تو اتنا اچھا لگتا ہے آپ کا اپنے پاس رہنا۔ لگتا ہے میں ایک بار پھر چھوٹی سی بچی بن گئی ہوں اور میری مما میرے لاڈ اٹھانے کے لیے میرے پاس موجود ہیں۔ اب تو میں سوچ رہی ہوں کہ پاپا سے کہوں کہ مجھے واپس مری نہ بھجوائیں اور یہیں کسی اسکول میں داخل کروا دیں۔'' مومو نے بہت سادہ سے لہجے میں اپنی قلبی کیفیات کا اظہار کیا تو کنول نے بے ساختہ اس کی پیشانی چوم لی اور بے حد محبت سے بولی۔

''تم دوبارہ چھوٹی سی بچی بنی ہو یا نہیں، یا تمہیں اپنے اور میرے درمیان عمروں کا زیادہ فرق نظر آتا ہو یا نہیں سچ یہ ہے کہ ہمارے درمیان ماں بیٹی کا رشتہ ہے اور اس رشتے کے حوالے سے تم مجھ سے جتنے چاہے لاڈ اٹھوا سکتی ہو۔''

''پھر وعدہ کہ آپ پاپا سے میرے یہاں ایڈمشن کے لیے بات کریں گی۔'' مومو نے کنول کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''وعدہ۔'' کنول نے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر وہ دونوں ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں باتیں کرتے کرتے مومو کب نیند کی وادی میں اتری اسے خبر نہ ہو سکی۔ اس کے سونے کے بعد کنول بہت دیر تک معظم کے رویے کے بارے میں سوچتی رہی۔ فیکٹری کے کسی مسئلے یا حسینہ کی موت کے باعث معظم کا یہ رویہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے انداز سے الجھا ہوا اور کنول سے گریزپا نظر آتا تھا۔ اس رویے کی کیا وجہ تھی کنول بہت غور کرنے کے باوجود سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بالآخر اس مسئلے کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ بھی مومو کی طرح نیند کی وادی میں اتر گئی۔

☆☆☆

''آپ نے پاپا سے مجھے دوبارہ یہاں شفٹ کرانے کے سلسلے میں بات کیوں نہیں کی کنول باجی؟'' معظم ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا تب بہت دیر سے اشاروں کنایوں میں کنول کو بات کرنے پر اکساتی مومو نے کچھ روٹھے ہوئے انداز میں استفسار کیا۔

اقتباس: چند یادیں' چند تاثرات' از عاشق حسین بٹالوی
تعاون: محمد خان شنواری' میٹرو ول سائٹ کراچی

''تمہارے پاپا نے مجھے موقع ہی کہاں دیا؟ سارا وقت تو اخبار منہ کے سامنے کیے بیٹھے رہے۔'' کنول نے لاچارے انداز میں موموکے شکوے کا جواب دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے پر میرے مسئلے کا کیا ہوگا؟ پاپا ابھی فیکٹری کے لیے نکل جائیں گے اور پھر رات گئے تک ان کی کوئی خبر نہیں ہوگی۔'' موموکی پریشانی اپنی جگہ تھی۔

''اچھا تم پریشان مت ہو، میں ابھی کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔ یوں بھی وہ تیار ہو کر ٹیبل پر نہیں آئے تھے اس کا مطلب ہے کہ انہیں فیکٹری جانے میں کچھ وقت لگے گا۔'' موموکو تسلی دے کر کنول اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ کمرے میں پہنچی تو معظم پینٹ شرٹ میں ملبوس آئینے کے سامنے کھڑا ٹائی باندھتا ہوا نظر آیا۔ کنول بیڈ کے کونے پر ٹک کر معظم کی اس مصروفیت کو دیکھتی رہی۔ ابھی تک اس کے اور معظم کے درمیان وہ بے تکلفی قائم نہیں ہوئی تھی کہ وہ بیویوں والا استحقاق استعمال کرتے ہوئے معظم کے ایسے کام اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیتی۔

''مجھے آپ سے ایک بات کرنی تھی۔'' معظم ٹائی باندھ کر فارغ ہوا تو کنول نے ہمت کر کے اسے مخاطب کیا۔ معظم سے بات کرنے میں اتنی مشکل اسے تب بھی پیش نہیں آتی تھی جب وہ محض اس کی سیکریٹری تھی۔ مشکل کا سبب معظم کے انداز میں پایا جانے والا انجانا سا گریز تھا۔

''کہو، میں سن رہا ہوں۔'' معظم نے اسے جواب دیا اور دراز کھول کر اس میں سے کاغذات نکالنے لگا۔

''میری اور موموکی خواہش ہے کہ اس کا یہ سال مکمل ہو جانے کے بعد اسے واپس یہیں بلا لیا جائے۔ بورڈنگ کی نسبت موموٰ یہاں میرے ساتھ گھر میں رہ کر زیادہ بہتر طریقے سے اپنی پڑھائی کر سکے گی۔'' کنول نے بنا کسی تمہید کے اپنا مدعا بیان کر دیا۔ جواب میں معظم بنا کچھ کہے اپنے کام میں مصروف رہا۔ اس نے دراز سے کاغذات نکالنے کے بعد اپنا بریف کیس بیڈ پر رکھا اور خود بھی وہیں بیٹھ کر کاغذات ترتیب سے بریف کیس میں رکھنے لگا کنول لب کاٹتے ہوئے اس کی یہ مصروفیت دیکھتی رہی۔ معظم کے انداز سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس نے کنول کی بات سنی ہی نہ ہو۔

''میرا پروگرام ذرا مختلف ہے اور اس پروگرام کے مطابق تم اور موموٰ اس گھر میں اکٹھی نہیں رہ سکتیں میں نے طے کیا ہے کہ فی الحال موموٰ بورڈنگ میں اور تم اپنی امی کے گھر میں رہو گی۔'' اس وقت کنول معظم کی طرف سے جواب ملنے کی امید ختم کر بیٹھی تھی معظم نے کھٹ سے بریف کیس بند کرتے ہوئے یہ جملہ ادا کیا جسے سن کر کنول بری طرح چونک گئی۔

''کیا مطلب؟'' کنول کے لہجے میں واضح طور پر سراسیمگی تھی۔

''تم اتنی خوفزدہ کیوں ہو؟ میں نے صرف ایک وقتی پروگرام کا ذکر کیا ہے۔'' معظم نے کنول کے خوفزدہ ہونے کو محسوس کیا۔

''لیکن کیوں؟ وقتی طور پر بھی میں اس گھر کو چھوڑ کر اپنی امی کے گھر کیوں رہوں گی؟'' کنول معظم کی بات سننے کے باوجود مطمئن نہیں ہوئی۔

''کبھی کبھی ہمیشہ ساتھ رہنے کے لیے وقتی دوری برداشت کرنی پڑتی ہے۔ حالات کچھ اس طرح کے ہیں کہ

مجھے پاکستان میں رہنا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم کہیں بیرونِ ملک شفٹ ہو جائیں گے۔ اپنے وطن سے دوری بے شک مشکل ہے لیکن یہ دوری ہمیں دوسری بہت سی قباحتوں سے بچالے گی۔'' معظم کا جواب بہت واضح نہ ہونے کے باوجود کنول نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور بولی۔ ''مجھے اندازہ ہے کہ آپ کس قسم کی مشکلات سے دوچار ہوں گے۔ لوگ ہماری شادی کو موضوع بنا کر آپ کو ذہنی طور پر ٹیز کر رہے ہوں گے اگر بیرونِ ملک شفٹ ہونے سے آپ کی یہ تکلیف دور ہوتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''تھینک یو کنول! مجھے تم سے یہی امید تھی لیکن دیکھو یہ سارا کام چند دنوں میں نہیں ہوگا مجھے جائزہ لینا پڑے گا کہ کہاں شفٹ ہونا بہتر ہے۔ ویسے میرا ارادہ ملائیشیا جانے کا ہے۔ وہاں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے، یہاں فیکٹری کو وائنڈ اپ کرنے اور پراپرٹی کو سیل کرنے کے لیے مجھے وقت درکار ہوگا۔ میں یہ کام پوری یکسوئی سے کرنا چاہتا ہوں اس لیے میری خواہش ہے کہ تم اس دوران اپنی امی کی طرف رہو۔ تمہاری اور مومو کی طرف سے بے فکری ہوگی تو میں اپنا کام زیادہ تیزی اور آسانی سے کر سکوں گا۔'' معظم، کنول کو اس کی امی کے گھر بھیجے جانے کی وجہ بیان کرنے لگا۔

''اس سب کے لیے میرا امی کے گھر جانا ضروری تو نہیں۔ میں آپ کے ساتھ رہ کر آپ کے کام میں مدد دے سکتی ہوں۔'' کنول نے خود کو میکے بھیجے جانے کے فیصلے پر اعتراض کیا۔

''جب میں ایسا کہہ رہا ہوں تو اس کا مطلب ہے یہ ضروری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جب ہم اپنی نئی زندگی کا باقاعدہ آغاز کریں تو میرے ذہن میں کوئی الجھن اور پریشانی نہ ہو۔ میں تمہیں اتنی ہی خوبصورتی کے ساتھ وہ سب دے سکوں جیسا کہ کبھی میں نے تمہارے لیے سوچا تھا۔'' معظم کی بات سن کر کنول کی دھڑکنیں مرتعش سی ہو گئیں۔ محبت جو گریزپا نظر آتی تھی درحقیقت اب بھی اس کے لیے قائم دائم تھی۔

''اس سارے سیٹ اپ کو بنانے میں جتنا بھی وقت لگے، میں تم سے رابطے میں رہوں یا نہ رہوں لیکن اس بات کا یقین رکھنا کہ میں جہاں بھی رہوں تمہارا ہوں اور ہمیں بالآخر ایک ساتھ رہنا ہے۔'' معظم نے گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے اس کا ایک اور جگنو کنول کے ہاتھ میں تھمایا۔

''مگر میں اس دوران کیا کروں گی؟ آپ سے رابطے میں رہے بغیر تو میرے لیے وقت گزارنا مشکل ہو جائے گا۔'' کنول اب بھی گھبرا رہی تھی۔

''تم کہیں جاب کر لینا یا پھر کسی کورس وغیرہ میں ایڈمشن لے لینا۔ میں باقاعدگی سے تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو خرچہ بھیجتا رہوں گا۔'' معظم نے اس کے مسئلے کا حل بتایا۔

''امی شاید آپ سے رقم لینے کو پسند نہ کریں۔'' کنول جو معظم سے شادی کے بعد مسلسل اپنے گھریلو حالات کے بارے میں فکرمند رہی تھی تشویش سے بولی۔ نکاح سے قبل اپنی امی کے سامنے بھی اس نے یہ مسئلہ رکھا تھا لیکن انہوں نے سختی سے ''یہ تمہارا مسئلہ نہیں۔'' کہہ کر بات ختم کر دی تھی۔ اب معظم نے پیش کش کی تو کنول کو خوشی تو ہوئی لیکن امی کی طرف سے وہ تذبذب کا شکار تھی کہ آیا وہ اس پیشکش کو قبول کریں گی بھی یا نہیں۔

''اگر تمہاری امی نے رقم لینے سے انکار کیا تو میں اس وقت تک تمہیں ان کے گھر چھوڑ دوں گا جب تک تمہارے چھوٹے بہن بھائی اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو جاتے۔'' معظم نے ایک طرح سے کنول کی زبانی ناجیہ کو وہ پیغام پہنچانے کا بندوبست کیا جس کے بعد ناجیہ کے پاس انکار کی کوئی صورت باقی نہیں بچتی تھی۔ کنول بھی اس بات کو سمجھتی تھی اس لیے چپ ہو گئی۔

''اگر تمہارے سوالات ختم ہو گئے ہوں تو میں جاؤں؟'' پوری گفتگو کے دوران پہلی بار مسکراتے ہوئے معظم نے کچھ شوخ سے انداز میں کنول سے سوال کیا۔

''سوال تو اتنے ہیں کہ یہیں اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے ہی زندگی گزر جائے۔'' جواباً کنول بھی شوخ ہوئی۔

''تو بس ابھی رہنے دو۔ باقی سوالات اس وقت کرنا جب ہم زندگی بھر ساتھ رہنے کے لیے دوبارہ اکٹھے ہوں۔'' معظم نے ہاتھ اٹھا کر کنول کو روکا اور بریف کیس لے کر کمرے سے نکل گیا۔ ساری زندگی کے حساب کتاب کے بعد وہ اس فیصلے پر پہنچا تھا کہ کنول کو کھونے کا خسارہ برداشت نہیں کر سکے گا اور اس خسارے سے بچنے کے لیے اس نے اپنی دنیا سب سے الگ بہت دور بسانے کا سوچا تھا۔ بس اس دنیا کو بسنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا مادی حوالوں سے بھی اور جذباتی اعتبار سے بھی۔ ذرا سے وقت اور دوری کے بدلے اگر زندگی بھر کی خوشیاں ملنے کا امکان تھا تو یہ سودا کچھ زیادہ مہنگا نہیں تھا۔